قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورس

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں

1) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطہ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹ کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

2) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I' II' III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

3) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل پتے پر رجوع کریں!

ناظم شعبہ خط و کتابت کورس

قرآن اکیڈمی' 36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون : 03-5869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: 53
شمارہ: 2
ذوالحجہ 1424ھ
فروری 2004ء
فی شمارہ -/15

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت
حافظ عاکف سعید
سید قاسم محمود
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 150 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 800 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون 03-5869501
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور
فون: 6316638-636638 فیکس: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرض احوال** ______ 3

حافظ عاکف سعید

✿ **ظروف و احوال** ______ 5

ملکی وملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہارِ رائے

✿ **منتخب نصاب۔۲** ______ 7

نظم جماعت کی پابندی

اور اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ

ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **اسلامی معاشرت** ______ 31

چہرے کا پردہ دانشوروں کی عقل پر

حافظ مبشر حسین لاہوری

✿ **دردِ دل مسلم**...... ______ 45

محبتِ رسولؐ کے عملی تقاضے

عاتکہ علاؤالدین

✿ **منہاج المسلم** ______ 63

o شرم وحیا
o احسان اور حسنِ سلوک
o سچائی

علامہ ابوبکر جابر الجزائری

✿ **دنیائے اسلام** ______ 79

الجزائر (۲)

سید قاسم محمود

❀ ❀ ❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

ہیں آج کیوں ذلیل......؟

امت مسلمہ کی عزت وسر بلندی قرآن اوراس کی تعلیمات کو تھامنے میں ہے۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جو خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارکہ کے ذریعے نہایت واشگاف الفاظ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی ﷺ یہ ارشاد فرما چکے ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ)) (رواہ مسلم)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے بہت سی قوموں کو بامِ عروج سے ہمکنار کرے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) قعرِ مذلت میں گرادے گا۔''

دین اور قرآن سے بے وفائی کے سبب ہی ہم آج اللہ کے عذاب کی زد میں ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ پوری امت پر لاچاری اور بے بسی مسلط ہے۔ حکیم الامت، مصور و مفکر پاکستان نے ہمیں ایک سو سال قبل متنبہ کر دیا تھا کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل پر بھی اللہ کی کتاب اور دین سے اعراض کے باعث ذلت ومسکنت کا عذاب مسلط کر دیا گیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں یہی ذلت و مسکنت آج ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ اسی بے بسی اور لاچاری کا ایک مظہر کشمیر پالیسی سے یوٹرن اور کشمیری مجاہدین کو دہشت گرد قرار دینا ہے۔ اس سے بڑھ کر کم ہمتی کیا ہو گی کہ ہمارا ایٹمی پروگرام ہماری نالائقیوں کی وجہ سے آج ہمارے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے اور اس کی حفاظت ''میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی'' کے مصداق اس

درجے کٹھن ہوگئی ہے کہ اس کو بچانے کی خاطر ہم اپنے نامور ایٹمی سائنس دانوں کو جو قومی سطح پر حد درجہ اعزاز و احترام کے مستحق ہیں' قربانی کا بکرا بنانے پر مجبور ہیں— قبل ازیں جنوبی وزیرستان کے قبائلی علاقوں پر فوج کی کارروائی بھی اسی لاچاری اور مجبوری کا شاخسانہ تھی جو امریکہ کی غلامی اختیار کرنے کے باعث ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے— ہمارے قومی جرائم کی سزا نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم پورے طور پر امریکہ کے محکوم بن چکے ہیں اور بھارت کے آگے سرنگوں ہیں۔

اگر ہم اس ذلت کے عذاب سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآن کی تعلیمات کی طرف رجوع اور پاکستان میں دین حق کے نفاذ کے لئے اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہونا ہو گا۔ بصورتِ دیگر دشمنانِ اسلام افغانستان اور عراق کے بعد ہمیں اسی طرح ایک ایک کر کے نشانہ بناتے رہیں گے۔ oo

- قربانی ہماری معاشرتی رسم ہے یا دینی فریضہ؟
- عیدالاضحیٰ اور قربانی میں باہم چولی دامن کا ساتھ کیوں ہے؟
- حج کے موقع پر منیٰ میں کی جانے والی قربانی اور اس موقع پر پوری دنیا میں کی جانے والی قربانی میں کیا ربط و تعلق ہے؟

ان سوالات کے جوابات کے لئے مطالعہ کیجئے:

عیدالاضحیٰ اور فلسفہ قربانی

از: **ڈاکٹر اسرار احمد**

قیمت اشاعت خاص 20 روپے ' اشاعت عام 12 روپے

ظروف و احوال

ملکی وملی مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا اظہار رائے

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاباتِ جمعہ کے آئینہ میں

(۱)

''مجلس عمل اب اسمبلیوں میں نفاذِ اسلام کے لئے جدوجہد کرے''

۲ جنوری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

حکومت اور مجلس عمل کے حالیہ گٹھ جوڑ پر اگرچہ ہر طرف سے پھبتیاں کسی جا رہی ہیں تاہم اس سمجھوتے سے ملک کے سیاسی افق پر چھائے ہوئے جمود کے بادل چھٹنے کی امید ہے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ قومی وصوبائی اسمبلیوں کو کام کرنے کا موقع ملے گا۔ البتہ اب مجلس عمل میں شامل دینی جماعتوں کا امتحان ہے کہ وہ اسلامی نظام کے نفاذ اور منکرات کے خاتمے کے حوالے سے اسمبلیوں میں اپنا کردار ادا کریں' کیونکہ ان کا عذر تھا کہ اس کام میں ایل ایف او سب سے بڑی رکاوٹ ہے' جواب دور ہو چکی ہے۔ امریکہ کے کہنے پر ہمارے حکمران اپنے معاشرے کو جس طرح مادر پدر آزادی کی طرف لے کر بڑھ رہے ہیں' وہ انتہائی تشویش ناک ہے۔ اگر ایم ایم اے اس بے دینی کا راستہ روکنے کے لئے اسمبلی میں مضبوط سٹینڈ لے تو انہیں دیگر دینی طبقات اور دینی حمیت رکھنے والے عوام کی بھی بھرپور تائید حاصل ہوگی۔

امریکہ اور اسرائیل کا اصل ٹارگٹ پاکستان اور اس کا ایٹمی پروگرام ہے۔ بھارت سے تعلقات کی بحالی اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے بیرونی دباؤ بھی اسی لئے ہے کہ ہمارے پاس ایٹمی صلاحیت برقرار رکھنے کا جواز ختم ہو جائے اور یوں ہمارا ایٹمی پروگرام رول بیک کرایا جاسکے۔ ان حالات میں صرف اللہ تعالیٰ کی مقتدر ہستی ہی ہمیں دشمن کے ان ہتھکنڈوں سے بچا سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ کے مخلص

بندے بن جائیں اور ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے عہد کے ذریعے اللہ سے وفاداری کا ثبوت دیں تاکہ اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہو جائے۔

(۲)

''مسئلہ کشمیر کے حل کے بعد ہمیں ایٹمی صلاحیت سے دستبرداری پر مجبور کیا جائے گا''

۹ جنوری ۲۰۰۴ء کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز

پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں حالیہ پیش رفت اور مذاکرات کی بحالی کا اعلان درحقیقت امریکہ کے دباؤ کا نتیجہ ہے' جس کا مقصد کشمیر کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرا کر پاکستان کو اس کی ایٹمی صلاحیت سے دست برداری پر مجبور کرنا ہے۔ امریکہ کی حکمت عملی یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر کے حل سمیت اپنے باہمی تعلقات ''کچھ دو کچھ لو'' کے اصول کی بنیاد پر معمول پر لے آئیں۔ یوں پاکستان کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہے گا کہ اس کی ایٹمی صلاحیت ہندوستان کے خلاف ایک ڈیٹرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام اپنی ابتداء ہی سے امریکہ اور مغربی ممالک کی نظروں میں بری طرح کھٹکتا رہا ہے۔ امریکہ کے نزدیک جوہری صلاحیت کے حوالے سے عراق' ایران اور لیبیا کا معاملہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور اس ضمن میں اب "Axis of Evil" پاکستان ہی کو قرار دیا جا رہا ہے۔ ایران اور لیبیا نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ایٹمی میدان میں ان کی ترقی پاکستان ہی کی مرہونِ منت ہے' جس کے نتیجے میں ہمارے خلاف کارروائی کرنے کے لئے کافی مواد اکٹھا کیا جا چکا ہے۔ نہ صرف امریکہ بلکہ جاپان' جرمنی' فرانس اور روس بھی اس امر پر متفق ہیں کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کر دیا جائے اور ایک اسلامی ملک کے یہ ''زہریلے دانت'' نکال دیئے جائیں۔ ہم نے بحیثیتِ قوم اللہ کی اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا' چنانچہ قرائن یہی بتاتے ہیں کہ اس نعمت کے سلب ہونے کا وقت قریب ہے۔

(باقی 94 پر)

مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب نمبر۲، از ڈاکٹر اسرار احمد

(اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات)

درس ۹

نظمِ جماعت کی پابندی اور اس سے رخصت اور معذرت کا معاملہ

نحمدهٗ ونصلّی علٰی رسوله الکریم ...... امّا بعدُ:

اعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۞ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۞ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ؕ وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۞﴾ (النور: ٦٢ تا ٦٤)

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْکَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ ۞ لَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿﴾﴾ (التوبۃ:٤٣ تا ٤٩)

ہمارے اس نصاب میں جو امور زیر بحث آئے ہیں ان سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ایک اسلامی نظمِ جماعت میں مامورین کو امراء کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ان میں آداب اور قواعد وضوابط بھی ہیں اور اصلاً اس اجتماعیت کی روحِ رواں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جہاں تک رخصتوں اور معذرتوں کا معاملہ ہے' اس ضمن میں سورۃ النور کی آخری آیات (٦٢ تا ٦٤) اور سورۃ التوبہ کی آیات (۴۳ تا ۴۹) میں بظاہر ایک تضاد سامنے آتا ہے۔ اس تضاد کو رفع کرنا اور ان دونوں میں تطبیق کا جاننا ضروری ہے۔

سورۃ النور کی آخری تین آیات (٦٢ تا ٦٤) کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر باریک بینی سے ان امور کی طرف رہنمائی کی جارہی ہے جن پر کسی اجتماعیت میں ایک عمدہ ماحول اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رہ سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓي اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۭ﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' اور جب وہ ان ؐ کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں ہوتے ہیں تو وہ وہاں سے ہرگز نہیں جاتے یہاں تک کہ اُن ؐ سے اجازت حاصل کرلیں''۔ یہاں نوٹ کیجئے کہ ''اِنَّمَا'' کلمۂ

حصر ہے۔سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کا اسلوب بھی یہی ہے اور وہاں بھی ایمانِ حقیقی کی دو شرائط یا دو لوازم بیان ہوئے ہیں ——— ایک اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور دوسرے اللہ کی راہ میں مال اور جان کے ذریعے جہاد۔ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہیں پڑے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ وہی لوگ ہیں سچے۔''

ان دو اجزاء میں سے ایک یہاں (سورۃ النور میں) بھی جوں کا توں موجود ہے' یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ دوسرا جزو وہاں جہاد فی سبیل اللہ بالمال والنفس ہے' جبکہ یہاں اس کی جگہ اس کے لازمی تقاضے کے طور پر اجتماعیت کا ایک وصف لایا گیا ہے' کیونکہ جہاد ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ایک اجتماعیت موجود نہ ہو۔ یہاں یہ ذہن میں رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہاں کون سی حیثیت مراد ہے؟ امیر یا سپہ سالار ہونے کی حیثیت! کیونکہ اگر آپؐ مدینہ میں ہیں تو سربراہِ مملکت ہیں' اگر کسی غزوہ پر تشریف لے گئے ہیں تو آپؐ کی حیثیت سپہ سالار کی ہے۔ جب تک آپؐ مکہ مکرمہ میں تھے آپؐ ایک جماعت کے امیر تھے۔ آپ ﷺ کی ان تمام حیثیتوں سے بالاتر اور عظیم ترین حیثیت یہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ باقی تمام حیثیتیں اس کے تابع ہیں۔لیکن ہر جگہ اس حیثیت کو علیحدہ سمجھ لینا چاہئے جس حیثیت کا ذکر اُس خاص مقام پر ہو رہا ہو۔ یہاں اجتماعی نظم کا معاملہ زیر بحث ہے۔ اگر انسان اجتماعی نظم کے معاملے میں بے پروا ہو جائے کہ اسے جو حکم ملا ہے اس کے مطابق کام کر لیا تب بھی ٹھیک ہے اور نہیں کیا تب بھی کوئی حرج نہیں' کہیں ساتھ گئے ہوئے ہیں اور کسی ڈیوٹی پر معین کئے گئے ہیں' اب جی میں آیا تو کھڑے رہے جی میں نہیں آیا تو وہاں سے چل دیئے' تو ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل اجتماعیت کی نفی ہے۔ اس قسم کے لوگ کتنی ہی کثیر تعداد میں جمع ہو جائیں وہ کبھی بھی جماعت نہیں کہلائیں گے' بلکہ وہ ایک ہجوم اور انبوہ ہوگا۔ علامہ اقبال

نے اسی کو اپنے ایک شعر میں واضح کیا ہے۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں

ہجوم تو بہت بڑا جمع ہو سکتا ہے لیکن دنیا میں کوئی کام ہجوم (mob) سے نہیں ہوا۔ یہ صرف کوئی منفی کام ہی کر سکتا ہے' لیکن کوئی مثبت اور تعمیری کام کرنے کے لئے ایک منظم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے' جن کے مراتب (cadres) معین ہوں کہ کون کس کا حکم سنے گا اور مانے گا' اس نظم میں کون کس سے بالاتر ہے' اس کی تعیین ہو اور اس میں سمع وطاعت کا نظام چل رہا ہو' جو کہ حضور ﷺ کے بعد لامحالہ سمع وطاعت فی المعروف ہے' لیکن اس میں سمع وطاعت کی روح برقرار ہو۔ یہ نہیں کہ جی میں آیا تو مان لیا' جی میں نہیں آیا تو نہیں مانا۔ کسی اجتماع میں بلایا گیا ہے تو اگر طبیعت آمادہ ہوئی تو پہنچ گئے' اگر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی تو نہیں آئے۔ چھوٹے چھوٹے عذرات اور معمولی مشغولیتیں اور مصروفیتیں آڑے آئیں۔ معاشرے کی عام رسومات کو اس کام میں آڑے آنے دینے سے درحقیقت یہ اندازہ ہوتا ہے گویا اس کام کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تو فرمایا کہ مؤمن تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سمع وطاعت کی یہ کیفیت پیدا ہو چکی ہے کہ جب بھی وہ رسولؐ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے ضمن میں ہوتے ہیں تو جب تک اجازت حاصل نہ کر لیں وہاں سے نہیں جاتے۔

آگے اسی بات کو اس کے دوسرے رخ کے حوالے سے بیان کر دیا کہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۚ﴾ ''(اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں''۔ یعنی جو لوگ آپؐ سے اجازت حاصل کر کے رخصت ہوتے ہیں' یا کسی کام پر طلب کیا گیا ہو تو اگر کسی وجہ سے نہیں آ سکتے تو پہلے سے عذر پیش کر کے آپؐ سے اذن حاصل کر لیتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں احساس ہے کہ ہمیں اس کام میں شامل ہونا چاہئے تھا' حضور ﷺ

جس مہم پر بھیج رہے ہیں اس میں بہ دل و جان شریک ہونا چاہئے تھا' ہمارے ایمان کا تقاضا یہی تھا کہ جب ہم ایک اجتماعی کام کے سلسلے میں حضور ﷺ کے ساتھ ہیں تو وہاں سے نہ ہلیں جب تک کہ آپؐ سے اجازت طلب نہ کر لیں۔ان کا یہ احساس بہت مبارک ہے' اور یہ احساس درحقیقت ان کے ایمان کی علامت ہے' اور ان کے احساسِ فرض اور ان کے تصورِ نظم جماعت کا مظہر ہے۔ یہاں ایک طرح سے ان کی تعریف کی جا رہی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ ﴾ ''پس جب وہ آپ سے اپنے کسی کام کی وجہ سے اجازت طلب کریں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں''۔یعنی جب وہ اپنے کسی معاملے کی وجہ سے آپ کے سامنے معذرت پیش کریں یا بیماری یا کسی اور اہم مصروفیت کی بنا پر آپ سے اجازت طلب کریں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیا کریں۔نوٹ کیجئے' فرمایا جا رہا ہے کہ جسے آپ چاہیں اجازت دیں۔ یہ قابل غور بات ہے۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر کسی نے معذرت کر لی ہے تو اب وہ یہ سمجھے کہ یہ آخری کام تھا جو میں نے کر لیا' اب مجھ سے اور کیا مطلوب ہے؟ میں نے نظم جماعت کا تقاضا تو پورا کر لیا' اب صاحب امر پر لازم ہے کہ وہ معذرت قبول کرے۔ یہ طرزِ عمل بھی اجتماعیت کی نفی ہے۔اجتماعیت کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ نے اپنا معاملہ صاحب امر کے حوالے کر دیا ہے' اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے عذر کو قابل قبول سمجھتا ہے یا نہیں۔اِس میں منطقی طور پر یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ ضروری نہیں ہوتا کہ کسی کام کی پوری اہمیت سب کو بتا دی جائے۔وہ صاحب امر ہی جانتا ہے کہ اس وقت کیا کام درپیش ہے' اس موقع کی کیا نزاکت واہمیت ہے اور اس کے نتائج کتنے دوررس واقع ہو سکتے ہیں' یہ لمحہ اس جماعت' تحریک اور دعوت کے لئے کتنا فیصلہ کن ہو سکتا ہے۔اب وہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرے گا کہ اس کے مقابلے میں میرے ساتھی کے عذر کی کیا نوعیت واہمیت ہے' اس نظم کو اس سے کتنا نقصان واقع ہونے کا اندیشہ

ہے' اور اس کی معذرت قبول نہ ہونے کی صورت میں اس کو کتنی تکلیف پہنچے گی۔ ظاہر ہے ہر معاملے میں توازن رکھنا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات لوگوں کے سامنے بھی ہو' لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کے سامنے ہو۔ بلکہ اس بارے میں حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے: ((اِسْتَعِيْنُوْا عَلَى الْحَوَائِجِ بِالْكِتْمَانِ)) ''اپنے مقاصد کے حصول میں اخفاء سے مدد لو''۔ اپنے تمام کارڈز ٹیبل پر نہیں رکھ دیئے جاتے' اپنے تمام منصوبوں کا اعلان نہیں کیا جاتا' بلکہ بسا اوقات ایک تحریک میں اور خصوصاً کسی انقلابی تحریک میں ایسے مراحل ناگزیر ہیں کہ آپ کرنا کچھ چاہتے ہوں اور آپ تاثر کچھ اور دیں۔ آپ نے جانا مشرق کو ہے لیکن کچھ ایسے احوال پیدا کر دیئے جائیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ایک ایک چیز علیحدہ کر کے بتا دی جائے۔ جس شخص پر امارت کی ذمہ داری ہے وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھتا ہے' لہٰذا اگر آپ اس نظم سے منسلک ہیں تو آپ کی روش یہ ہونی چاہئے کہ آپ نے ایک عذر پیش کر دیا' اب ذہناً تسلیم کریں کہ صاحب امر کا اختیار ہے' اگر وہ میرے عذر کو قابل قبول سمجھتا ہے تو ٹھیک ہے' نہیں سمجھتا تو دنیا کی کوئی مجبوری ورکاوٹ اور کوئی مشغولیت اس کام سے بڑھ کر اہم نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ترجیحات کی تعیین نہ ہوئی تو کام آگے نہیں چلے گا اور قدم قدم پر رکاوٹ پیش آئے گی۔ چنانچہ اس راہ میں پہلی شرطِ لازم یہی ہے کہ آدمی طے کر لے کہ یہ کام مقدم ہے اور باقی سب کچھ مؤخر ہے ؏ شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

ہر تحریک میں ہر مرحلہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ فیصلہ کن ہی ہو' لہٰذا اس موقع کے اعتبار سے اگر آپ نے کوئی عذر پیش کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے' لیکن نظم کا تقاضا یہ ہوگا کہ یہ نہ سمجھئے کہ عذر کا پیش کر دینا ہی بس آخری تقاضا تھا' جو پورا ہو گیا۔ بلکہ انسان کو ذہناً تیار ہونا چاہئے کہ اگر عذر قبول ہوگا تو ٹھیک ہے' ورنہ مجھے ہر دوسرے کام پر اس کام کو ترجیح دینی ہے۔

آگے فرمایا: ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ان کے لئے اللہ سے

استغفار بھی کیجئے''۔ اب یہاں نوٹ کیجئے کہ انہوں نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے کہ استغفار کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تو اجازت طلب کی ہے' وہ بغیر اذن کے نہیں گئے ہیں اور ان کو اللہ پہلے سے سند دے چکا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کسی دنیاوی مصروفیت کو اتنا اہم سمجھا کہ دین کے کام سے رخصت چاہی اور فی نفسہٖ یہ شے ایک کمزوری کی علامت ہے۔ ع ''نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی!'' کے مصداق میں یہ بات کبھی اس انداز سے بھی سمجھایا کرتا ہوں کہ فرض کیجئے اگر کوئی بیمار ہے تو کیا شفا آپ کے ہاتھ میں ہے؟ اور اس کی زندگی اور موت کا دارومدار آپ کی موجودگی پر ہے؟ اگر کسی کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا آپ کے وہاں جائے بغیر تدفین نہیں ہوگی؟ یا فرض کیجئے کہ کوئی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے تو کیا آپ جا کر حضرت عزرائیل کو روک لیں گے؟ اسی بات کا دوسرا رخ دیکھئے! کیا اللہ ہر چیز پر قادر نہیں ہے؟ کیا وہ وہاں آپ کے بغیر اس ضرورت کو پورا نہیں فرما سکتا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) ''اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس کے کسی کام میں لگا ہوا ہو تو اللہ اس کے کام کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے''۔ یہ تو انسانوں کا باہمی معاملہ ہے' آپ اپنے کسی بھائی یا رفیق یا کسی عزیز کے کام میں لگے ہوئے ہیں تو اللہ آپ کے کام میں لگ جاتا ہے' تو آپ سوچئے کہ اگر آپ اللہ کے کام میں لگے ہوئے ہوں تو کیا اللہ آپ کے کام میں نہیں لگے گا؟ بقول شاعر ؎

کارسازِ ما بہ فکر کارِ ما
فکر ما در کارِ ما آزارِ ما!

یعنی میرا کارساز میرے کام کی فکر میں ہے اور اپنے کام کی خود فکر کرنا میرے لئے آزار کا موجب بن جاتا ہے۔ انسان کی فکر محدود ہے' علم محدود ہے اور عقل محدود ہے' تو جب وہ خود فکر کرے گا' خود تدبیر کرے گا تو لازماً ٹھوکر کھائے گا اور اپنے لئے مصیبت کھڑی کر لے گا۔ تو کیا ''تفویض الامر الی اللہ'' آسان ترین نسخہ نہیں ہے کہ ''اپنے کام کو اللہ

کے حوالے کر دو"۔ اور کسی کام کا اللہ کے حوالے کر دینے کا انتہائی یقینی طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے کام میں لگ جائیں۔ ویسے تو آپ خود تدبیر کرتے ہوئے بھی اللہ سے دعا مانگ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ اللہ کی نصرت کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ لازماً آپ کی نصرت کرے گا۔ اس لئے کہ کسی شریف اور بامروّت انسان سے بھی یہ بات بعید ہے کہ آپ اس کے دست و بازو بنیں اور وہ آپ کو تن تنہا چھوڑ دے، تو اللہ کے بارے میں کیسے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے! اور دین کا کام ایک طرح سے اللہ کی نصرت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ﴾ "اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کے معاملے میں؟" ایک اور جگہ فرمایا: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ﴾ "اللہ جاننا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اُس کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں غیب میں ہونے کے باوجود"۔ یعنی فی الاصل تو یہ ایک کمزوری ہے، البتہ جنہوں نے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرنے کی پرواہ ہی نہیں کی، جنہیں نظم کا سرے سے احساس ہی نہیں ہے، ان سے تو یقیناً بہتر ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنا عذر پیش کیا، معذرت کی اور اجازت طلب کی۔ لیکن فی الاصل یہ ایک کمزوری کی بات ہے۔ دین کے اس کام میں تو ایسا ہونا چاہئے کہ "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!" کہ جو کچھ بھی ہو، ہم تو اب دریا میں اپنی کشتی ڈال چکے ہیں اور ہم نے اپنے تمام معاملات بہ تسلیم و رضا اللہ کے حوالے کر دیئے ہیں۔ ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

اس ضمن میں سورۃ التغابن کے درس میں جو چیزیں آتی ہیں، یعنی تفویض الامر اور تسلیم و رضا، ان تمام کیفیات کو یہاں اپنے ذہن میں لے آیئے۔ تو فرمایا: ﴿فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ

﴿مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''آپ ان میں سے جن کو چاہیں اجازت دے دیں اور ان کے لئے اللہ سے معافی طلب کریں' یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے''۔ اور اسی کا ایک عکس' جیسا کہ سورۃ التغابن میں فرمایا' تمہیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔

اس حوالے سے امراء کے لئے کیا ہدایات ہیں' یہ بات اگلے درس میں آئے گی' لیکن یہاں یہ نوٹ کر لیجئے کہ حضور ﷺ کا طرزِ عمل یہی تھا کہ آپؐ سے جو بھی آ کر عذر پیش کرتا آپؐ جرح کئے بغیر اس کا عذر قبول کر لیتے اور رخصت عطا کر دیتے تھے۔ اس لئے کہ خواہ مخواہ کسی کے لئے ایک ایسی آزمائش پیدا کر دینا یا اس کے لئے فوری طور پر کوئی بڑا امتحان لے آنا خلافِ مصلحت ہے۔ اس کی حقیقت آگے چل کر کھلے گی۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر محسوس بھی ہو کہ میرے کسی ساتھی نے اس وقت کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے تب بھی اس کے لئے استغفار کریں اور خود بھی اسے معاف کریں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بھی تو غفور ہے' رحیم ہے۔ سورۃ التغابن کی یہ آیت ذہن میں تازہ کیجئے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو' اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور ہے' رحیم ہے۔''

یعنی اپنے اہل و عیال کی تربیت کے اعتبار سے جو روش اَنسب ہے وہی اختیار کرنی چاہئے اور وہی روش امراء کو اپنے مامورین کے ساتھ اختیار کرنی چاہئے۔ اب یہاں بظاہر خطاب تو حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں بالواسطہ طور پر خطاب کا رخ لوگوں کی طرف ہے کہ تم اپنی جگہ پر یہ سمجھ لو کہ دین کے اس کام سے عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا فی الاصل ایک کمزوری ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یا تو اللہ پر توکل میں کمی ہے یا آپ ابھی مطمئن نہیں ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں خامی اور کمی ہے۔ ؏ نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی!

اب آگے چلئے۔ فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ﴾ ''مت ٹھہراؤ رسول کے بلانے کو اپنے مابین اس طرح جیسے تمہارا ایک دوسرے کو بلا لینا''۔ یہاں لفظ دعا (پکارنا' بلانا) محتمل المعنیین ہے اور اس کے دونوں مفہوم مراد لئے گئے ہیں۔ یہاں ''رسول کو بلانا'' بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آپ رسول کو بلا رہے ہوں اور ''رسول کا بلانا'' بھی ہو سکتا ہے کہ رسول آپ کو بلا رہے ہوں۔ یہ پکارنا دوطرفہ مفہوم کا حامل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ رسول سے گفتگو کرنے کو تم ایسا نہ سمجھ لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو۔ آپ ﷺ کا ادب واحترام اور ان کی تعظیم ملحوظ نہیں رکھو گے تو اس اجتماعیت کو نقصان پہنچے گا جس کی شیرازہ بندی رسول کی مرکزی شخصیت کے گرد ہو رہی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحجرات میں پورے شرح وبسط کے ساتھ آ چکا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۞﴾ (آیات ۲'۳)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور ان سے اس طرح بلند آہنگی سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' مبادا تمہارے سب اعمال غارت ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ حقیقت میں تو وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو رسول کے سامنے پست رکھتے ہیں وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے''۔

وہاں واقعات کے پس منظر میں ہدایات بھی آ گئیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۞ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞﴾ (آیت ۴)

''یقیناً جو لوگ پکارتے ہیں آپؐ کو حجروں کے باہر سے ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ ان کی طرف نکل آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا' اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے''۔

تو یہ رخ بھی یہاں مراد ہو سکتا ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحجرات میں آ گیا ہے۔ یہاں ایک بات اور نوٹ کر لیجئے کہ اسی ادب و احترام کا ایک عکس اپنے امراء کے لئے ہونا چاہئے۔ بیعت ارشاد میں بھی یہی آداب تلقین کئے جاتے ہیں کہ جس مرشد کے ساتھ آپ نے اپنا ایک تعلق قائم کیا ہے' آپ اس سے رہنمائی چاہ رہے ہیں' اس کی ہمت سے آپ اپنی ہمت کی تقویت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اگر اس کا ادب و احترام نہیں ہوگا تو آپ ہی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا' ان کا کیا بگڑے گا' جیسے کہا جاتا ہے: باادب بانصیب' بےادب بےنصیب۔ یہاں پر وہ معاملہ درجہ بدرجہ اس نظم جماعت میں بھی ہے کہ ہر شخص اپنے سے بالاتر کے ساتھ یہی انداز اختیار کرے۔ اسی کی انتہائی شکل آپ کو ملٹری ڈسپلن میں ملتی ہے۔ اپنے سے بالاتر کو سلیوٹ کرنا اسی حوالے سے ہے۔ اگر یہ نہیں کر رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نظم اور ڈسپلن کا مظاہرہ نہیں ہو رہا۔ لہٰذا اپنے امراء کے ساتھ ادب و احترام کا معاملہ نہ صرف بالفعل موجود ہو بلکہ ظاہر بھی ہو رہا ہو' اس کی ایک فضا طاری ہو جائے۔ ان آداب کے اعتبار سے یہ تو ایک پہلو ہو گیا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ کو رسول نے بلایا اور طلب کیا ہے تو اسے کسی دوسرے کے طلب کرنے کے برابر نہ ٹھہرالو۔ کسی اور کی طلبی پر آپ حاضر ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اسے تھوڑی سی شکایت ہو جائے گی' وہ کچھ گلہ شکوہ کر لے گا لیکن رسولؐ کے بلانے کو اس پر قیاس نہ کر لینا۔ اس کو بھی ذہن میں رکھئے کہ ایک تو بحیثیت رسول ان کا بلند ترین مقام ہے' لیکن اسی میں ہمارے لئے رہنمائی اور تعلیم مضمر ہے کہ اسلامی نظم جماعت میں امیر کا طلب کرنا اپنے کسی دوست' کسی بھائی یا کسی عزیز کا طلب کرنا نہیں ہے۔ اس نظم جماعت کی طرف سے جب طلب کیا جائے تو نقشہ وہی ہونا

چاہئے جو اِن اشعار میں بیان ہوا ہے ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں' راحت تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

یہ دو اشعار بہت عمدہ ہیں اور یہ تحریکی مزاج کے عکاس ہیں کہ کسی انقلابی جماعت میں شریک لوگوں کا کیا انداز ہونا چاہئے۔ یہ کہ جیسے ہی گھنٹی بجی اور اس جرس کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی' تو آواز تنہا واپس نہیں گئی' ہم اس کے ساتھ ہی گئے۔ اس راستے میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں' خیریت جاں' راحت تن' صحت داماں' ان میں سے کوئی چیز بھی راستے میں رکاوٹ نہیں بنی۔

بہر حال جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عذر پیش کرنا فی الاصل کمزوری کا اظہار ہے۔ کیوں نہیں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کرتے؟ کیوں نہیں اپنے معاملات سے بے فکر ہو کر اس کام میں لگ جاتے؟

آگے فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ج﴾ ''اللہ ان کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں''۔ ''قَدْ'' کے آنے سے بات میں ایک قطعیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر فعل ماضی پر آتا ہے اور اس کو ''فعل حال مکمل'' (Present Perfect Tense) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہاں یہ مضارع پر آ رہا ہے اور اس سے مراد ہے کہ یہ معاملہ ایک ہی واقعہ سے متعلق نہ سمجھنا' بلکہ اللہ کا یہ معاملہ دائمی ہے' جاری و ساری ہے اور اس میں قطعیت اور حتمیت ہے۔ یہاں لفظ ''یَتَسَلَّلُوْنَ'' استعمال ہوا ہے۔ سَلَّ' یَسُلُّ کا مطلب ہے نیام سے تلوار کھینچ لینا' تلوار سونت لینا۔ باب تفعُّل میں تَسَلَّلَ' یَتَسَلَّلُ کا مطلب ہوگا کھنچ جانا' خود نکل جانا۔ بہترین ترجمہ ہوگا کھسک جانا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں تم میں سے وہ لوگ جو کھسک جاتے ہیں ایک دوسرے کی اوٹ لے کر۔

حضور ﷺ نے طلب کیا ہے تو جمع تو ہو گئے‘ لیکن اب ڈر رہے ہیں کہ معلوم نہیں مسئلہ کیا ہے۔ شاید کوئی عام بات ہو‘ یا ویسے ہی مشورہ ہو‘ یا کوئی سماجی قسم کا معاملہ ہو‘ اس مغالطے میں پہنچ تو گئے۔ آگے جا کر معلوم ہوا کہ کوئی جیش بھیجنا ہے‘ لشکر کی روانگی کا فیصلہ ہے۔ حضور ﷺ نے مطالبہ رکھا ہے کہ ﴿ اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ ”نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل“۔ لہٰذا اب جان پر بنی ہوئی ہے کہ کسی طریقے سے نظر بچا کر کھسک جائیں۔ ان الفاظ میں ایک پوری ذہنیت کا نقشہ موجود ہے کہ جو جان کترا کر نکل جاتے ہیں۔ حالانکہ اہلِ ایمان کا معاملہ تو اس کے برعکس یہ ہوتا ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

ایک اور مقام پر اس ذہنیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ ۚ فَاِنۡ اَصَابَہٗ خَیۡرُ ۨ اطۡمَاَنَّ بِہٖ ۚ وَ اِنۡ اَصَابَتۡہُ فِتۡنَۃُ ۨ انۡقَلَبَ عَلٰی وَجۡہِہٖ ۚ خَسِرَ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِیۡنُ ﴿﴾ (الحج: ۱۱)

”لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے کنارے‘ پس اگر اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش پہنچتی ہے (کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے) تو اپنے چہرے کے بل واپس پلٹتا ہے۔ اس نے دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی۔ یہ ہے صریح خسارہ“۔

چنانچہ آگے فرمایا: ﴿فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ اَنۡ تُصِیۡبَہُمۡ فِتۡنَۃٌ اَوۡ یُصِیۡبَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿﴾ ”تو ڈرنا چاہئے ان لوگوں کو جو رسولؐ کے معاملے کی مخالفت کر رہے ہیں مبادا اُن پر کوئی بہت بڑا فتنہ مسلط ہو جائے یا اللہ کی طرف سے ان پر کوئی دردناک عذاب مسلط کر دیا جائے“۔

﴿ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ ﴾ ”خبردار رہو! آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے“۔ لِلّٰہِ کے شروع میں جو لام ہے یہ ”لامِ تملیک“ بھی ہے اور ”لامِ استحقاق“ بھی۔ یہ قدرت کے لئے بھی ہے‘ یعنی جو کچھ بھی آسمان و زمین میں ہے اللہ

ہی کا ہے' اللہ ہی کے دست قدرت میں ہے' کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں' کوئی چیز اس کے اختیار سے آزاد نہیں۔ تمام عناصر فطرت اس کے حیطۂ قدرت میں ہیں۔ تمام سلسلۂ اسباب وعلل اُس مُسبب الاسباب کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ تم چلے جاؤ گے تو یہ ہو جائے گا اور تم گھر میں نہیں رہو گے تو یہ ہو جائے گا۔ ہو گا وہی جو اذنِ ربّ ہو گا۔ اور اگر تم اس کے ساتھ اپنے معاملے کو درست رکھو تو وہ تمہارے معاملے کو درست کرے گا۔ ﴿قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ﴾ "تم جس روش پر ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔ بامحاورہ ترجمہ ہو گا کہ تم جتنے پانی میں ہو اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ جس روش پر تم ہو وہ اس کے علم میں ہے۔ ایمان کتنا کچھ ہے' اس میں نفاق کس حد تک سرایت کر گیا ہے' اس میں کس حد تک واقعتاً آخرت کی ترجیح ہے اور کس حد تک دنیا طلبی شامل ہو گئی ہے' اللہ خوب جانتا ہے۔ ﴿وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ﴾ "اور جس دن وہ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ ان کو (اپنے علم کامل کی بنا پر) جتلا دے گا (بتا دے گا) جو کچھ کہ انہوں نے عمل کیا تھا"۔ ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اب آیئے دوسرے مقام کی طرف۔ یہ سورۃ التوبۃ کی آیات ۴۳ تا ۴۹ پر مشتمل ہے۔ یہاں پس منظر میں غزوۂ تبوک اور اس کے لئے نفیر عام ہے۔ لہٰذا یہاں جو ایک بہت بڑا بنیادی فرق ہے اگر پہلے اس کو سمجھ لیا جائے تو دونوں مقامات کے مابین جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے اس کو رفع کرنے میں مدد ملے گی۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران جتنی بھی جنگیں اور غزوات ہوئے اور آپؐ نے جتنے بھی سریئے بھیجے' کبھی بھی آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس میں ہر مسلمان کا شریک ہونا لازمی ہے' بلکہ سارا دار و مدار ترغیب وتشویق پر ہوتا تھا کہ لوگو! نکلو اللہ کی راہ میں اور جنت حاصل کرو۔ ﴿سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ کے مصداق ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر نفیر عام ہوئی اور سب کے لئے نکلنا لازم قرار دیا گیا' اِلّا یہ کہ کوئی شخص عذر پیش کر کے

اجازت حاصل کرے۔ تو اس طرح کا لزوم صرف غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ وہاں منافقین کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ ۹ ھ تھا اور اس وقت تک یہ شجرۂ خبیثہ پورے طور پر برگ و بار لا چکا تھا۔ اب وہ آ رہے ہیں اور جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر حضور ﷺ سے اجازت طلب کر رہے ہیں۔ اور حضور ﷺ کی مروّت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی کسی جھوٹے کو اس کے مُنہ پر جھوٹا نہیں کہا۔ یہ نہ سمجھئے کہ حضور ﷺ ان کے حالات سے بے خبر تھے۔ یہ تو ہر صاحب بصیرت شخص اندازہ کر لیتا ہے کہ فلاں شخص اس وقت جھوٹ بول رہا ہے اور اس شخص کی اصل کیفیت کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو عام اہل ایمان کے بارے میں فرمایا: **((اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ))** ''مؤمن کی فراست سے ڈرو' اس لئے کہ وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''۔ تو آپ غور کیجئے کہ حضور اکرم ﷺ کی فراست کا عالم کیا ہو گا! لیکن حضور ﷺ اچھی طرح جاننے کے باوجود اُن کے عذر تسلیم کر لیتے تھے اور انہیں رخصت دے دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ وہ جری ہو کر استہزاء کے انداز میں کہا کرتے تھے کہ ''**هُوَ اُذُنٌ**'' کہ یہ تو صرف کان ہی کان ہیں۔ گویا ان کے دماغ میں (معاذ اللہ) بھیجا نہیں ہے' ہم جھوٹ بولتے ہیں اور یہ مان لیتے ہیں' ہم جا کر بالکل بغیر کسی حقیقت کے کوئی بناوٹی عذر پیش کرتے ہیں اور وہ تسلیم کر لیتے ہیں' جو چاہو اِن کے کان میں اتار دو یہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہونا چاہئے کہ حضور ﷺ کی یہ عادت کس قدر راسخ تھی کہ جس نے عذر پیش کیا آپؐ نے قبول کر لیا۔ اس میں یقیناً مصلحت بھی تھی' جو آگے بیان ہو جائے گی۔ جو بھی چیز اخلاقِ عالیہ و فاضلہ کے مطابق ہو گی اس میں مصلحت بھی ہو گی' لیکن اگر کسی وقت بالفعل کوئی مصلحت نظر نہ آئے تو بھی کوئی حرج نہیں' آدمی اس پر اپنے اخلاق کے تقاضے کے اعتبار سے عمل کرتا ہے۔

یہاں ذرا گرفت کا انداز ہے۔ حضور ﷺ کو کچھ ٹوکا گیا ہے کہ ﴿**عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ**ۚ﴾ یہ ''انشائیہ'' کلمہ بھی ہو سکتا ہے اور خبریہ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ''رضی اللہ عنہم'' خبریہ کلمہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''اللہ ان سے راضی ہو گیا''۔ اور دعائیہ کلمہ بھی ہو سکتا ہے ''اللہ

ان سے راضی ہو جائے''۔ تو یہاں بھی دو ترجمے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ''اللہ نے آپؐ کو معاف فرما دیا''۔ یہ کلامِ خبریہ ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ''اللہ آپ کو معاف فرمائے''۔ یہ کلام انشائیہ ہے۔ لیکن کس بات پر؟ فرمایا: ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۞﴾ ''آپؐ نے ان کو اجازت کیوں دی (آپ نے ان کا عذر کیوں قبول کیا) یہاں تک کہ آپ پر واضح ہو جاتا کہ کون ہیں جو (اپنے ان عذرات میں) سچے ہیں اور آپ جان لیتے کہ کون ہیں جو جھوٹے ہیں''۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں بھی وہی الفاظ آئے ہیں جیسے سورۃ العنکبوت کے آغاز میں آئے ہیں۔ وہاں فرمایا: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۞﴾ ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''اللہ لازماً جان کر رہے گا ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور لازماً جان کر رہے گا ان کو بھی جو جھوٹے ہیں''۔ لیکن چونکہ اللہ تو جانتا ہے' اس کا علم تو کامل ہے' لہٰذا ہم ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اللہ لازماً ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں''۔ آگے چل کر پھر یہ بات آئی کہ: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۞﴾ ''اللہ لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون مؤمن صادق ہیں اور لازماً کھول کر رکھ دے گا کہ کون منافق ہیں''۔ تو یہاں پر بھی وہی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی آزمائش ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا ہے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ جب آپ نے عذر قبول کر لیا تو آزمائش ختم ہو گئی اور ان کے نفاق پر پردہ پڑا رہ گیا۔ اگر آپ تحقیق کرتے اور پھر آپ کہتے کہ نہیں یہ عذر تو اس قابل نہیں ہے کہ اسے قبول کیا جائے' ذرا دیکھئے کہ سلطنتِ روما سے ٹکراؤ شروع ہو چکا ہے' کتنا نازک وقت ہے جو اسلام اور عالم اسلام پر آ گیا ہے اور آپ لوگ اپنے ان عذرات کو پیش کر رہے ہیں' آپ کا عذر قبول نہیں ہے۔ اگر آپؐ یہ کہہ دیتے تو اب ان کے لئے امتحان ہو جاتا۔ جانا تو انہوں نے پھر بھی نہیں تھا' لیکن واضح تو ہو جاتا کہ ان کے اندر سرکشی ہے' تمرّد ہے' معصیت اور نافرمانی ہے۔ جب آپؐ نے اجازت دے دی' معذرت قبول کر لی تو اُن کے نفاق کا پردہ چاک نہیں ہوا۔

آ گے فرمایا: ﴿لَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ ؕ﴾ ''یقیناً جولوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے یہ رخصت نہیں چاہ سکتے (معذرت نہیں کر سکتے) کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اپنے جان اور مال سے''۔ وہ کبھی عذر پیش کر کے یہ درخواست نہیں کریں گے کہ انہیں دل و جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ یہ تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے' لہٰذا اہل ایمان اس سے کیسے رخصت طلب کریں گے؟

یہ ہے وہ ظاہری تضاد جو اِن دو مقامات پر نظر آتا ہے۔ وہاں الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ ''(اے نبی!) جو لوگ آپ سے اذن طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر''۔ جبکہ یہاں فرمایا کہ ''جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو اذن طلب نہیں کرتے''۔ یہ بظاہر ایک دوسرے کے برعکس باتیں ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تضاد نہیں۔ ایک تو اس کی تاویل خاص ہے کہ سورۃ التوبۃ کی آیات غزوۂ تبوک کے پس منظر میں نازل ہوئی ہیں' لیکن اس سے قطع نظر عام حالات میں بھی اس کی تطبیق یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر تین سیڑھیاں ہوں جیسے منبر کی ہوتی ہیں' تو ظاہر ہے کہ پہلی سیڑھی سے دوسری بلند تر ہے' لیکن تیسری کے مقابلے میں یہ پست تر ہے۔ چنانچہ بلندی اور پستی اضافی (relative) چیزیں ہیں۔ یہ بات اگر سامنے رکھی جائے کہ کون سی شے کس کے حوالے سے پست ہے اور کس کے حوالے سے بلند ہے تو پھر اس کے تین درجے ہوں گے۔ اصل درجہ جو مطلوب ہے وہ یہ کہ رخصت طلب ہی نہ کی جائے' اس لئے کہ اگر آپ کو اللہ کی قدرت پر اور اس کے مُسبب الاسباب ہونے پر یقین ہے' آپ مانتے ہیں کہ اللہ آپ کی ضروریات کو آپ سے بہتر جانتا ہے اور وہ آپ کے مسئلے کو خود آپ کے انداز سے کہیں بہتر طور سے حل کر سکتا ہے تو پھر عذر کی گنجائش کہاں سے نکلے گی؟ تو جو کوئی بھی واقعتاً ان باتوں پر ایمان رکھتا ہے وہ تو عذر پیش نہیں کرے گا' رخصت نہیں چاہے گا۔ لیکن اس سے نیچے آیئے تو معلوم ہوگا کہ کچھ

لوگ ایسے بھی ہیں جو چپکے سے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور اجتماعی معاملات میں شریک ہی نہیں ہوتے' یا وہاں سے خاموشی سے کھسک جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ عذر پیش کرتے ہیں اور نہ رخصت طلب کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مقابلے میں عذر پیش کرنے والے صاحب ایمان قرار پائے کہ ان کے مقابلے میں ان کے ایمان کی نفی ہو جائے گی جو عذر بھی پیش نہیں کرتے ۔لیکن معیارِ مطلوب اور مقامِ مقصود یعنی total commitment کے اعتبار سے معذرت اور رخصت طلب کرنا گویا ایمان کی نفی کے مترادف ہے۔ چنانچہ یہ درحقیقت relative معاملہ ہے۔

اس میں دوسرا پہلو تاویل خاص کا ہے کہ جب نفیر عام نہ ہوتو عذر کا طلب کیا جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے' اور جب اس شدت کے ساتھ حکم دیا گیا ہو کہ اب ہر ایک کو نکلنا ہےتو اس سے موقع کی جو نزاکت سامنے آتی ہے اس کے اعتبار سے عذر طلب کرنا کوئی اور معنی رکھے گا۔ تو ان دونوں پہلوؤں سے ان کے مابین تطبیق کو جان لینا چاہئے ۔

آگے ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ ''اور اللہ جانتا ہے ان کو کہ جن کے دلوں میں تقویٰ ہے''۔ جن میں ایمان ہے' خشیت ہے' انابت ہے' وہ اللہ کی رضا جوئی میں سرگرداں اور سرگرم ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''یقیناً (اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے (اس موقع پر بھی) اجازت طلب کرتے ہیں تو وہی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے'' ﴿وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۞﴾ ''اور ان کے دل (ریب اور) شک کے اندر مبتلا ہو چکے ہیں (ان کے دلوں میں شکوک وشبہات نے ڈیرے جما لئے ہیں) تو وہ اپنے اس شک کی وجہ سے متردّد ہو کر رہ گئے ہیں''۔ رَدَّ ' يَرُدُّ کا مطلب ہے ''لوٹا دینا'' اور باب تفعُّل میں اس کا مطلب ہوتا ہے ''خود لوٹنا''۔ اور مُتَرَدِّد ہے ''خود لوٹنے والا''۔ تو گویا یہ متردّد ہو کر رہ گئے ہیں کہ آگے بڑھیں نہ بڑھیں! چلیں نہ چلیں! اسی کو تَرَبُّص کہا گیا ہے۔

آ گے ارشاد ہے: ﴿ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً ﴾ ''اور اگر ان کا واقعی نکلنے کا ارادہ ہوتا تو انہوں نے اس کے لئے تیاری کی ہوتی (اہتمام کیا ہوتا' سامان جمع کیا ہوتا)۔'' ان کا طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ ان کی نیت خراب تھی' عین وقت پر آ کر کہہ دیا کہ میری یہ مجبوری ہے جبکہ اس کے لئے اہتمام سرے سے کیا ہی نہیں۔ انہوں نے اپنے مسائل کے حل کے لئے کوئی بھاگ دوڑ نہیں کی۔ ان کا اصل ارادہ تو اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر ان کا واقعی نکلنے کا ارادہ ہوتا تو کچھ تیاری تو کرتے۔ ﴿ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ ﴾ ''لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہیں تھا''۔ اب یہاں سے تصویر کا دوسرا رخ شروع ہو رہا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی کوئی اندھی' بہری کائنات نہیں ہے' اس میں ایک ایسی ہستی کا ارادہ کارفرما ہے جو سمیع اور بصیر ہے' حی اور قیوم ہے' علیم اور خبیر ہے۔ اگر کسی کو توفیق نہیں ملی تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہے کہ ان کو توفیق نہ ملے۔ یہ اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں' اللہ نے ان کا نکلنا پسند نہیں کیا۔ ﴿ فَثَبَّطَهُمْ ﴾ ''پس انہیں جما دیا''۔ زمین میں ان کو گاڑ دیا' ان کے پاؤں منوں کے ہو گئے' وہ نکل نہیں پائے ﴿ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۞ ﴾ ''اور (انہیں) کہا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ''۔ اصل میں توفیق اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کا بھی اس نے قاعدہ بنایا ہے کہ جس کا ارادہ ہوگا اسی کو توفیق ملے گی' جس کا ارادہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسے زبردستی توفیق دے تو کائنات کا سارا نظم ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ تو امتحان گاہ ہے۔ جیسے کہا گیا ہے: ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ ''اس نے موت اور حیات کو تخلیق کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے عمل کے اعتبار سے اچھا''۔ وہ لشکر کے ساتھ کسی کو زبردستی نکال دیا کرے تو نکلنے والوں کا کوئی کریڈٹ نہیں رہے گا اور نہ نکلنے والے قصوروار قرار نہیں پائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی سنت سابقہ اور حکمت تخلیق کے مطابق ہے کہ جن کا ارادہ نہیں ہوتا انہیں اللہ بھی دفع کرتا ہے' جیسے سورۃ التوبہ میں کہا گیا ہے: ﴿ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ ''جاؤ (دفع ہو جاؤ) انتظار کرو' یہاں تک کہ اللہ اپنا آخری فیصلہ سنا

دے''۔ لہٰذا اللہ ہی نے نہیں چاہا کہ وہ نکلیں اس کی راہ میں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے کیوں نہیں چاہا کہ وہ اس کی راہ میں نکلیں؟ یہ تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ فرمایا: ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِیْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا﴾ ''اگر یہ تمہارے ساتھ نکلتے (اور اس مہم میں تمہارے مابین ہوتے) تو نہ اضافہ کرتے تمہارے لئے مگر برائی کا''۔ یہ حقیقت ہے کہ disgruntled element سے کوئی خیر وجود میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ بے دلی سے کام کرنے والا کام بنائے گا کم اور بگاڑے گا زیادہ۔ وہ بدگمانیاں پیدا کرے گا' طرح طرح کے شوشے چھوڑے گا اور لوگوں میں انتشار پیدا کرے گا۔ تو ایسے لوگوں کا اس جمعیت میں ہونا تو درحقیقت ایک بالقوہ کمزوری (potential weakness) ہے۔ تعداد زیادہ ہونا ہر حال میں مفید نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ اس قسم کے تھڑدلے' خام ارادے رکھنے والے اور دنیا پرست لوگ تمہاری صفوں میں شامل ہوں۔ ﴿وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ یَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ﴾ ''اور لازماً تمہارے مابین فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے''۔ وہ تمہارے لئے فتنوں کی تلاش میں تمہاری صفوں کے مابین گھوڑے دوڑاتے۔ وہ تو چاہیں گے کہ کہیں سے کوئی بات اُچک کر دوسری جگہ جا کر اسے ہوا دیں اور بے اطمینانی پیدا کریں۔ کہیں اوس اور خزرج کے مابین پرانی عصبیتوں اور حمیتوں کی چنگاری بھڑکا کر انہیں آپس میں ٹکرانے کی کوشش کریں۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ اسی میں ہوتی ہے۔ اس طرح تو بہت اچھا ہوا کہ تمہاری جمعیت جو نکلی وہ خالص جمعیت تھی اور وہ ان عناصر سے پاک رہی۔

آگے فرمایا: ﴿وَفِیْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ﴾ اس کے بھی دو ترجمے ممکن ہیں اور دونوں ہی نہایت حکیمانہ ترجمے ہیں۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا: ''تم میں ہیں وہ لوگ جو بہت سننے والے ہیں ان کے لئے''۔ اس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تمہاری صفوں میں وہ لوگ موجود ہیں جو اُن کی باتیں بڑے دھیان سے' کان لگا کر اور دلی آمادگی سے سنتے ہیں۔ پرنالہ وہیں گرتا ہے جہاں نشیب ہو۔ تو وہ نشیب ان کے اندر ہے' لہٰذا

پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے مابین ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کے لئے سنتے ہیں' یعنی تمہاری خبریں وہاں پہنچانے کے لئے تمہارے درمیان موجود ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں جاسوسی کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں' درحقیقت ان کی حیثیت transmitters کی ہے۔ یہ لوگ تمہاری باتیں خوب کان لگا کر سنتے ہیں کہ کوئی خبر رہ نہ جائے' کیونکہ انہوں نے فتنے کی آگ بھڑکانے کے لئے یہ باتیں ان تک پہنچانی ہوتی ہیں۔ ﴿ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾ ''اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔ اللہ کی نگاہوں سے وہ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ ﴾ ''اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام بنانے کے لئے ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں' یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے رہے''۔ اب یہ وہ تاریخی پس منظر ہے کہ اے نبی! یہ آپ کے لئے پہلے سے بہت سے فتنے اٹھا چکے ہیں' بہت سے مواقع پر انہوں نے فتنوں کی آگ بھڑکائی ہے اور آپ کے لئے معاملات کو تلپٹ کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ قَلَّبَ' يُقَلِّبُ' تَقْلِيْبٌ کا مطلب ہے بدل دینا' کسی شے کو الٹ دینا۔ جیسے ارشاد ہوا: ﴿ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ (الانعام:111) ''ہم پلٹ دیں گے ان کی نگاہوں اور دلوں کو اسی طرح جس طرح یہ پہلی مرتبہ (حق کا انکشاف ہونے کے باوجود) اس (کتاب) پر ایمان نہیں لائے تھے''۔ تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ آپ کے لئے معاملات کو تلپٹ کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے رہے ہیں' یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا امر ظاہر ہو گیا۔ یہ جو حق آیا ہے یہ انہیں پسند نہیں ہے' ان کو تو اس پر بڑی ناگواری ہے' لیکن ان کی ناپسند اور ناگواری کے علی الرغم اللہ کا فیصلہ آ گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس وقت تک جزیرہ نمائے عرب میں تو حضور ﷺ کو غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ غزوۂ تبوک سن ۹ ھ کا معاملہ ہے اور سن ۸ ھ میں مکہ

فتح ہو چکا' سن ۸ ھ ہی کے شوال میں غزوۂ حنین بھی ہو چکا تھا اور یوں سمجھئے کہ سرزمین عرب میں آخری معرکہ وہی تھا۔ چنانچہ عرب پر تو غلبہ ہو چکا تھا اور لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ سب کچھ جو ہوا ہے یہ بھی ان کی ناپسندیدگی کے علی الرغم ہوا ہے۔ اب بیرونِ ملک عرب' بین الاقوامی سطح پر انقلابِ محمدیؐ اور غلبۂ دینِ حق کا جو مرحلہ شروع ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بھی انہیں پسند نہیں ہے۔ لہٰذا یہ اگر آپؐ کے ساتھ جاتے تو کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرتے' وہاں بھی کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتے۔ تو ایک اعتبار سے بہتر ہی ہوا کہ یہ نہیں گئے۔

اب دیکھئے' ایک ہی بات کے کتنے رخ ہیں۔ ﴿لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ ''آپؐ نے انہیں کیوں اجازت دی؟'' یہ علیحدہ بات ہے۔ آپ کو اجازت نہیں دینی چاہئے تھی' تاکہ ان کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی اور ان کی پردہ دری ہوتی کہ یہ کیا ہیں اور کتنے پانی میں ہیں' لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہی بہتر ہے کہ وہ نہیں آئے۔ اس بات کو ہم اپنے معاملات پر منطبق کریں تو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امیر جماعت کو ذہناً اس طرزِ عمل پر مطمئن رہنا چاہئے کہ وہ اجتماعی معاملات میں ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلنے کی پوری کوشش کرے' لیکن اگر کوئی پیچھے رہتا ہے تو اس کے لئے زیادہ متفکر نہ ہو' اس کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیچھے رہ جانے ہی میں بھلائی ہو۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ تبوک میں بیس دن قیام پذیر رہے لیکن لڑائی نہیں ہوئی' تو یہ ایک طرح سے اہل ایمان کی بہت اعلیٰ درجے کی پکنک تھی کہ حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور گفتگو ہو رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ اس طرح گفتگو کے مواقع تو سب کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ بیرونِ مدینہ سے بھی لوگ اس لشکر میں موجود تھے۔ ۳۰ ہزار کے لشکر میں جانے کہاں کہاں سے لوگ آئے ہوں گے۔ اور یہاں صبح و شام سب اہل ایمان آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ تو وہاں پر کبھی ذکر ہو جاتا تھا کہ فلاں صاحب کیوں نہیں آئے؟ تو حضور ﷺ اس تذکرے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

آپ ﷺ کا قول مبارک ہوتا تھا کہ ((دَعْــهُ)) کہ چھوڑو اس کے ذکر کو۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو اللہ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر اس میں شر ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے شر سے نجات دی' اسی میں بہتری ہے۔ تو دراصل یہ انداز ہونا چاہئے۔ کسی کے بارے میں یہ بھی طے نہ کیجئے کہ لازماً شر ہے۔ اس لئے کہ آپ کے پاس تو علم کامل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عین وقت پر کوئی مجبوری پیش آ گئی ہو' زیادہ سے زیادہ خیر اور حسنِ ظن کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کریں' لیکن تشویش کو روکنے کے لئے اصولاً اس بات کو جان لیں کہ ہر شخص کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہر شخص اپنا نامۂ اعمال بنا رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے' اپنے لئے کمائی کر رہا ہے یا اپنے لئے وبال جمع کر رہا ہے' لہٰذا اس معاملے میں ہم کیوں خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا ہوں' اگر خیر ہے تو وہ ظاہر ہو جائے گی' کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تلافی کا معاملہ پیدا کر دے گا اور اگر شر ہے تو شر کا تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔

آگے ارشاد ہے: ﴿ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ ؕ ﴾ ''ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالئے!'' اس قول کی ایک خاص تاویل بھی ہے اور عام تاویل بھی۔ دونوں کو سمجھ لینا چاہئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے تو اجازت دے ہی دیجئے' مجھے آزمائش میں مت ڈالئے! یعنی اجازت نہیں دیں گے تو جانا تو میں نے پھر بھی نہیں' لیکن خواہ مخواہ میرے نفاق کا پردہ چاک ہو جائے گا! کیونکہ دل میں یہ فیصلہ پہلے سے موجود ہے۔ اگر آپ اجازت دے دیں گے تو میرا پردہ پڑا رہ جائے گا' مجھے خواہ مخواہ اس امتحان میں نہ ڈالئے' مجھے اس ابتلا اور فتنے میں مبتلا ہونے سے بچا لیجئے۔ فرمایا: ﴿ اَلَا فِى الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا ؕ ﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ فتنہ میں تو وہ پڑ چکے''۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ جب انہوں نے اللہ کی پکار پر' اللہ کے رسولؐ کے فرمان پر' اس جماعت کے کسی نظم کے تقاضے پر جو اقامت دین کے لئے قائم ہوئی تھی' اپنی کسی ذاتی ضرورت' مصروفیت یا کسی مصلحت کو مقدم رکھا تو فتنے میں تو وہ پڑ چکے۔ امتحان اور کس شے کا نام ہے؟ ناکامی اور کس بلا کا

نام ہے؟ ناکام تو وہ ہو چکے! سَقَطَ ' یَسْقُطُ کسی شے کے وقوع کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا ایک مفہوم گر پڑنے کا بھی ہے۔ یعنی یہ تو گر چکے' ناکام ہو چکے' اب اور کس آزمائش سے بچنے کی فکر ہے؟ ﴿ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ "اور جہنم ان کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔ اس سے بچ کر کہاں جائیں گے؟

متذکرہ بالا قول کے بارے میں ایک خاص واقعہ بھی آتا ہے کہ جد ابن قیس (ایک منافق) نے آ کر بڑے گستاخانہ اور استہزائیہ انداز میں کہا کہ حضورؐ! مجھے تو آپ اس آزمائش میں نہ ڈالئے! میں ذرا حسن پرست انسان ہوں اور جس علاقے میں آپ یہ لشکر لے کر جا رہے ہیں وہاں کی رومی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں' معلوم نہیں میں اپنے اوپر قابو رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں' تو مجھے تو آپ اس امتحان میں نہ ڈالئے۔ مفسرین نے یہاں خاص طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ تاویل خاص ہوگی' لیکن تاویل عام اس واقعہ کی محتاج نہیں ہے' بلکہ وہ خود اپنی جگہ پوری طرح واضح ہے کہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار کے جواب میں عذر پیش کرنا اور رخصت طلب کرنا ایک کمزوری کی علامت ہے اور خاص طور پر جنہوں نے نفیر عام کے اس موقع پر رخصت چاہی وہ تو گویا اپنی ناکامی پر مہر تصدیق پہلے ہی ثبت کروا چکے۔ اللہ تعالیٰ ان کیفیات سے ہمیں اپنی امان میں رکھے!

بارك الله لی ولکم فی القرآن العظیم

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

چہرے کا پردہ دانشوروں کی عقل پر!

تحریر: حافظ مبشر حسین لاہوری

عورت کا غیر محرم سے چہرے کا پردہ کرنا ایک ایسا شرعی حکم ہے جس پر گزشتہ چودہ صدیوں سے اُمت مسلمہ کی خواتین عمل پیرا رہی ہیں۔ اس عرصہ میں خواہ مسلمانوں کو انفرادی یا اجتماعی سطح پر عروج رہا یا زوال آیا' چہرے کے پردہ کی شرعی حیثیت بہرصورت قائم رہی۔ لیکن کچھ عرصہ سے ''مغرب گزیدہ'' دانشور پردہ کی شرعی حیثیت کو متاثر کرنے کے لئے اس پراپیگنڈہ میں مصروف ہیں کہ ''پردہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ہے'' —— ''پردے کا حکم صرف صحابیات یا ازواجِ مطہرات کے لئے تھا'' —— ''یہ عربوں کی تہذیبی رسم تھی جسے اسلام نے پسند کیا' مگر واجب نہ کیا''...... وغیرہ۔ حالانکہ چہرے کا پردہ ایک ایسا شرعی حکم ہے جو تا قیامت اُمت مسلمہ کی خواتین کے لئے' مع استثنائی صورتوں کے' واجب التعمیل ہے۔ اس ضمن میں دلائل سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر نظریات کی تردید پیش کر دی جائے۔

یاد رہے کہ اسلامی احکام کا تعلق صرف عرب معاشرے تک ہرگز محدود نہ تھا' کیونکہ اسلام ایک ابدی دین ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنی وسعت رکھی ہے کہ یہ قیامت تک پیش آنے والے ہر طرح کے مسائل میں راہنمائی فراہم کر سکے۔ اس وسعت کا یہ معنی نہیں کہ اسلام میں قیامت تک پیدا ہونے والی ہر چیز کا نام لے کر اس کے متعلقہ احکام ذکر کئے گئے ہیں' بلکہ اسلام نے کچھ اصولی احکام پیش کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں ہر اُس مسئلہ کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے جو تا قیامت وقوع پذیر ہوتا رہے گا۔ مثلاً لباس کے بارے میں اسلام کے چند اصولی احکام یہ ہیں کہ لباس موسمی تغیرات (گرمی و سردی وغیرہ) سے بچانے والا ہو' مطلوبہ ستر پوشی اور زیب و زینت کا فائدہ دیتا ہو' خواہ یہ اَن سلی چادروں کی شکل میں ہو یا کاج بٹن لگے سوٹ کی شکل میں' یہ

چوغے کی شکل میں ہو یا شلوار قمیص کی صورت میں' قدیم دَور کے عربوں کا ہو یا جدید دور کے پاکستانیوں کا! اسلام اس وقت تک لباس سے تعرض نہیں کرتا جب تک کہ لباس اسلام کے ان بنیادی اصولوں اور حدود و قیود سے تعرض نہ کرتا ہو جو لباس کے سلسلہ میں شریعت نے متعین کر دیئے ہیں۔ اس لئے یہ مطالبہ قطعی بے بنیاد ہے کہ عہد نبویؐ میں صحابہ کرام ؓ لباس کے لئے جس طرح کھلی چادریں اور ان میں بٹن کی جگہ کانٹے استعمال کرتے تھے تو ہم بھی ضرور اسی طرح کی چادریں اور ان میں کانٹے استعمال کریں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ لباس کے سلسلہ میں جو اصول وضوابط اور حدود و قیود اُن کے لئے اُس دَور میں متعین تھیں وہی آج ہمارے لئے بھی متعین ہیں اور تا قیامت ہر مسلمان کے لئے متعین رہیں گی' اور اسلام کے ابدی دین ہونے کا بھی یہی معنی ہے۔

لباس سے متعلقہ اصول وضوابط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت غیر محرم سے اپنا چہرہ چھپائے' خواہ بڑی چادر سے گھونگھٹ نکال کر اس حکم شرعی پر عمل کرے یا برقع اور سکارف کے ذریعے منشاءِ خداوندی کی تکمیل کرے۔ لہٰذا یہ دعویٰ قطعی غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عہد صحابہ تک مختص تھا' جبکہ اس دعویٰ کی پشت پر کوئی مضبوط دلیل بھی کارفرما نہیں۔ اور اگر ایسے ظنی و تخمینی دعوے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہر شخص کو یہ بہانہ مل جائے گا کہ وہ اسلام کے جس حکم کو چھوڑنا چاہے گا یہ کہہ کر چھوڑ دے گا کہ یہ تو صحابہ کرامؓ کے لئے مختص تھا۔ نتیجتاً اللہ کا دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا!

اسی طرح یہ دعویٰ بھی جہالت پر مبنی ہے کہ چہرے کا پردہ عرب معاشرے کی قدیم تہذیبی رسم تھی جسے اسلام نے محض پسندیدہ سمجھتے ہوئے اپنے اندر سمو لیا اور اسے ''وجوب'' کا درجہ نہیں دیا۔ حالانکہ قرآن وسنت اور تاریخ عرب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دَورِ جاہلیت میں عرب عورتوں کے ہاں پردے کا چلن تو درکنار الٹا بن سنور کر اور اپنے آپ کو نمایاں کر کے گھروں سے باہر نکلنے کا رواج تھا اور ان کے ہاں بے پردگی' فحاشی' بے حیائی اور زناکاری اس سے کم نہ تھی جس میں آج مغرب مبتلا ہے۔ حتیٰ کہ نزولِ وحی کے ابتدائی ڈیڑھ عشرے تک چہرے کے پردہ پر عمل درآمد مسلمان ہونے والی صحابیات میں بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس پردہ نہ کرنے کی بیسیوں مثالیں آپ کو

مل جائیں گی۔ اگر چہرے کا پردہ فی الواقع اہل عرب کی کوئی تہذیبی رسم تھی تو پھر حقائق اس کی تردید کیوں کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ چہرے کا پردہ کوئی عربی تہذیبی رسم ہرگز نہیں تھی بلکہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس کی طرح ڈالی اور ایک نئی معاشرتی تہذیب کی بنیادیں استوار کیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چہرے کا پردہ ازواجِ مطہرات کے لئے خاص تھا' جبکہ عام مسلمان خواتین کے لئے اس میں رخصت دی گئی ہے۔ اس کے جواب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہے کہ اگرچہ قرآن وسنت میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جو صرف آنحضرت ﷺ یا آپؐ کی ازواجِ مطہرات یا کسی صحابی کے ساتھ مختص تھے' لیکن ان مخصوص احکام کی کوئی لمبی چوڑی فہرست نہیں بلکہ انہیں انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عمومی احکام سے علیحدہ کرنے کے لئے قرآن وسنت میں ان کے لئے خصوص کی دلیل ضرور فراہم کر دی گئی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے یا نہیں۔ جبکہ ان معدودے چند احکام کے سوا دیگر تمام کے تمام احکام پوری اُمت کے لئے تاقیامت عمل کے لائق ہیں' خواہ وہ مسنون ومستحب حیثیت میں ہوں یا فرض وواجب کی حیثیت میں۔

قرآن وسنت میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ چہرے کے پردے کا حکم خاص ازواجِ مطہرات کے لئے ہے۔ اگرچہ بعض آیات میں مسئلہ مذکور کے حوالے سے ازواجِ مطہرات سے خطاب کیا گیا ہے' مگر اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ حکم بھی خاص انہی کے لئے ہے' بلکہ ان کے ساتھ دیگر خواتین کو بھی حجاب کا حکم دیا گیا ہے۔ البتہ اُمت کی ماؤں سے اس حکم پر عمل درآمد کے آغاز کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ مذکور کا تعلق چونکہ صرف خواتین کے لئے تھا اس لئے ضروری تھا کہ اس کی ابتداء آنحضرت ﷺ کے گھر سے کی جائے۔ اس سلسلہ میں سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت ہی کافی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ﴾ (آیت:۵۹)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے' اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں

سے کہہ دیجئے کہ وہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے چہروں پر اپنی چادریں لٹکا (کر گھونگھٹ نکال) لیا کریں۔"

گویا یہ آیت آنحضرت ﷺ کی ازواج و بنات کے ساتھ تمام مسلم خواتین کو بھی اپنے حکم میں شامل کیے ہوئے ہے' لہٰذا اگر ازواجِ مطہرات اور بناتِ رسولؐ کے لئے پردہ ضروری تھا تو عام خواتین کے لئے کیوں ضروری نہیں؟ مذکورہ بالا حکم میں وہ بھی شامل ہیں!

چہرے کے پردہ کے وجوب کے حوالے سے قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی دیگر معروضات پیش کرنے سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ ستر و حجاب کا فرق واضح کر دوں' کیونکہ بعض "متجددین" ستر و حجاب میں امتیاز کی بجائے خلط مبحث کر کے قرآنی احکام کو مبہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں' جبکہ فی الواقع ان دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ عربی زبان میں "ستر" لغوی طور پر کسی چیز کو چھپانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور شرعی اصطلاح میں ستر سے مراد مَرد و زن کے وہ خاص اعضاء ہیں جنہیں عام طور پر مخفی رکھنا ضروری ہے' یعنی مَرد اپنی ناف سے گھٹنے تک کا درمیانی حصہ اپنی بیوی کے سوا ہر شخص سے چھپا کر رکھنے کا پابند ہے۔ اسی طرح عورت اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا باقی سارا جسم ماسوائے شوہر کے' محرم و غیر محرم ہر شخص سے چھپا کر رکھنے کی پابند ہے۔ البتہ "حجاب" ستر سے مستزاد ایک ایسا حکم ہے جو عورتوں کے لئے خاص ہے۔ یعنی عورت حالت نماز یا محرم رشتہ داروں کی موجودگی میں "ستر" کے حکم پر عمل کرے گی جس میں چہرہ اور ہاتھ کھولنے کی اجازت ہے' جبکہ غیر محرموں کے سامنے عورت اپنا چہرہ بھی نہیں کھول سکتی' بلکہ غیر محرم کی موجودگی میں ستر کے ساتھ ساتھ چہرہ چھپانا بھی ضروری ہے اور اسی کو شرعی اصطلاح میں حجاب کہا جاتا ہے۔ گویا عورت کے لئے حجاب صرف اس وقت ضروری ہے جب کوئی غیر محرم دیکھنے والا موجود ہو۔ اس کے باوجود شریعت نے چند صورتوں میں غیر محرم سے پردہ نہ کرنے کی رخصت بھی دی ہے۔ مثلاً عورت کا اپنے غلام سے پردہ نہ کرنا' انتہائی عمر رسیدہ سے پردہ نہ کرنا' وغیرہ۔

قرآن مجید کے دو مقامات ایسے ہیں جہاں احکامِ ستر و حجاب کا تفصیلی ذکر ہے۔

ایک سورۃ الاحزاب اور دوسرا سورۃ النور۔ اگرچہ مصحف میں سورۃ النور مقدم ہے مگر ترتیب نزولی میں سورۃ الاحزاب پہلے ہے۔ سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت میں ازواجِ مطہرات اور دیگر مسلمان عورتوں کو چہرے کے پردہ کا حکم اس طرح دیا گیا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ﴾ (آیت:۵۹)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں' بیٹیوں اور مؤمنوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے چہروں پر اپنی چادریں لٹکا (کر گھونگھٹ نکال) لیا کریں''۔

اس آیت میں ''يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ'' (اپنے چہروں پر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں) کا جملہ چہرے کے پردے کے لئے دلیل فراہم کرتا ہے۔ جلباب عربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں جبکہ ''دَنَا ۔ يَدْنُوْ'' میں قرب ونزدیکی کا مفہوم لغوی طور پر پایا جاتا ہے۔ عربی گرامر کے مطابق ''دَنَا ۔ يَدْنُوْ'' ثلاثی مجرد میں قریب ہونا' جھکنا اور لٹکنا کا معنی دیتا ہے جبکہ ثلاثی مزید فیہ میں قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اگر اس کا صلہ ''عَلٰی'' آئے تو اس میں اِرخاء یعنی اوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ چونکہ مذکورہ آیت میں اس کا صلہ ''عَلٰی'' آیا ہے اس لئے عربی لغت کے مطابق اس کا درست مفہوم یہی ہوگا کہ ''عورتیں بڑی چادروں سے گھونگھٹ نکال لیا کریں'' اور یہی گھونگھٹ' جس کی جگہ اب برقعے نے لے لی ہے' اُس دَور کا پردہ تھا۔ لیکن مغرب زدہ متجددین اس جملے کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ''وہ چادر کو اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ لیا کریں'' اور اس طرح عورت کو چہرے کے پردہ سے آزادی دلانے کی مذموم کوشش کرتے ہیں' حالانکہ یہ ترجمہ عربی لغت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے' کیونکہ یہ ترجمہ تب درست تسلیم کیا جا سکتا تھا جب ''يُدْنِيْنَ اِلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ'' ہوتا' جبکہ قرآن مجید میں اِلَيْهِنَّ (اِلٰی کے ساتھ) نہیں بلکہ عَلَيْهِنَّ (عَلٰی کے ساتھ) ہے۔ لہٰذا اس کا وہی مفہوم درست ہے جو جمہور مفسرین نے پیش کیا ہے' یعنی اپنی چادر اپنے اوپر ڈال کر گھونگھٹ نکالیں۔ اور یہی مفہوم صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کے ہاں مروج تھا۔ جیسا کہ مفسر قرطبی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ' حضرت عبیدہ سلمانیؒ اور حضرت قتادہؒ کے حوالے سے اس جملے کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ:

''عورت بڑی چادر کے ساتھ اپنا پورا جسم چھپا لے اور راستہ دیکھنے کے لئے صرف ایک آنکھ کھلی رکھے' اور اگر دو آنکھیں بھی ظاہر ہو جائیں تب بھی کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ پیشانی' ناک' سینہ اور چہرے کا بڑا حصہ ڈھانپا ہوا ہو۔''

(تفسیر قرطبی' ص ۲۱۷' ج ۱۴)

حضرت ابن عباسؓ کی یہی تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے بھی بیان کی ہے۔ البتہ عبیدہ سلمانی کے حوالے سے حافظ موصوف نے یہ واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ محمد بن سیرین نے ان سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انہوں نے بجائے جواب میں کچھ کہنے کے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور چہرہ ڈھانپ لیا اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھی۔ (ابن کثیر' ص ۸۲۵' ج ۳)

یاد رہے کہ چادر اوڑھنے کی مذکورہ بالا تفسیر میں صحابہ کرام میں اختلاف نہیں تھا اور صحابیات بھی اس آیت کے پیش نظر چہرے کا پردہ کرنا ضروری خیال کیا کرتی تھیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا واقعۂ افک بیان فرماتی ہیں کہ ''اتنے میں ایک شخص صفوان بن معطل سُلمی اس جگہ آیا اور اس نے مجھے سوتے دیکھ کر پہچان لیا' کیونکہ حجاب کا حکم اترنے سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھے پہچانتے ہوئے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنا چہرہ اپنی جلباب (چادر) سے ڈھانپ لیا۔ [فخمرتُ وجھی بجلبابی] (بخاری' کتاب المغازی' ح ٤١٤١)

گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا غیر محرم سے چہرہ چھپانے کے لئے جلباب اوڑھنا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ''یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ '' کے قرآنی حکم میں چہرے کا پردہ کرنا سرفہرست ہے۔ لیکن اس کے باوجود عورتوں کے چہروں سے پردے اتارنے کے لئے ہمارے ''دانشوروں'' کا مذکورہ آیت سے ایسا مفہوم کشید کرنا کہ جس کی تائید نہ لغت عرب سے ہوتی ہے اور نہ ہی وہ مفہوم صحابہؓ وصحابیاتؓ کے ہاں مروج تھا

اور نہ ہی عقل اس کا ساتھ دیتی ہے' آخر کس سوچ کی ترجمانی کرتا ہے؟

بعض حضرات نے جلبابَ والی اس آیت کے حوالے سے ایک عجیب شوشایہ چھوڑا ہے کہ:

''اس آیت میں حکم شرعی نہیں بلکہ ایک ایجابی پہلو ہے جس سے مقصود ایک معاشرتی مسئلہ سے نبٹنا ہے۔ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں دو قسم کی خواتین تھیں۔ ایک آزاد مؤمنات (خواتین) اور دوسری باندی۔ آخر الذکر اپنے سر کھلے رکھتی تھیں' اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ آزاد مؤمن خاتون کا تشخص باندی سے جدا قائم رکھا جائے تاکہ وہ باندیوں کی طرح اوباش لوگوں کی طرف سے ستائی نہ جائیں۔ جلباب سے یہ ممکن ہو گیا۔ اب بازار میں گزرتے ہوئے جلباب میں لپٹی ہوئی مسلمان عورت کو دُور سے ہی دیکھ کر پہچان لیا جاتا اور اس طرح اوباش لوگ ان سے احتراز کرتے۔ تمام مفسرین نے اس آیت کریمہ کی کم وبیش یہی شانِ نزول بیان کی ہے۔ بقول القرطبی حضرت عمرؓ اس باندی کو درّہ مارتے جس کا سر ڈھانپا ہوا ہوتا' تاکہ آزاد مؤمنہ اور باندی عورت کا جداگانہ تشخص برقرار رہے...... یہ آیت باندی اور آزاد عورت کی تمیز سے متعلق ہے۔ اس سے زیادہ خیال آرائی کی یہ آیت متحمل نہیں' کیونکہ متن اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا''۔

(حرفِ تمنا' ارشاد احمد حقانی' بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور' ۰۲-۱۱-۲۹)

مذکورہ بالا طویل اقتباس میں موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پردہ اُس دَور میں محض ایک ضرورت کے لئے کیا گیا' نہ کہ بطورِ شرعی حکم کے۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے' اس لئے کہ نزولِ وحی کے ۲۳ سالہ عرصہ میں بوقت ضرورت مختلف احکام نازل ہوتے رہے اور ان کا تعلق بھی اگرچہ اس دَور کے مخاطبین کے ساتھ رہا مگر وہی احکام تاقیامت ابدی و دائمی حیثیت میں متعین ہو گئے۔ جس طرح نماز اور زکوٰۃ کو اُس دَور کے لئے خاص قرار نہیں دیا جا سکتا اسی طرح پردے کا حکم بھی اُس دَور کے لئے مختص نہیں کیا جا سکتا! پھر یہ بھی ایک جزوی چیز ہے کہ پردے کے ذریعے آزاد اور لونڈی میں تمیز مقصود تھی۔ علاوہ ازیں جہاد کے تاقیامت جاری رہنے سے لونڈی اور غلام کا جاری رہنا اگر ممکن ہے تو پھر پردے کا جاری رہنا کیوں غیر ممکن قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عمرؓ نے باندی کو مارنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حکم میں آزاد عورتوں کی مشابہت کرتی تھی' تو گویا ''اصل'' تو آزاد عورتیں ہوئیں اور حکم بھی اصل کے ساتھ قائم ہے۔ خواہ باندیاں موجود ہوں یا مفقود' آزاد عورت کو ہر حال میں پردہ کرنا ہوگا!

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ باندیوں کو تنگ کرنے والے ''اوباش'' لوگ مسلمان نہیں ہو سکتے۔ پھر جب اسلام جزیرہ نمائے عرب میں مستحکم ہوگیا تو ظاہر ہے کہ اوباش لوگوں کا وجود ختم ہوگیا ہوگا۔ پھر چاہئے تو یہ تھا کہ آزاد عورتوں کو پردہ نہ کرنے کی رخصت دے دی جاتی' مگر معاملہ اس کے برعکس اس طرح تھا کہ آزاد عورتیں خلفائے راشدین کے دَور میں بھی پردے کے حکم پر عمل کرتی رہیں اور باندیوں کو مستثنیٰ رکھا جاتا۔ (دیکھئے حجاب المرأۃ المسلمۃ لابن تیمیہ' ص۳۶)

جب ہمارے لبرل طبقہ کی آیتِ احزاب سے چہرے کے پردہ کی رخصت نکالنے میں کوئی بن نہیں پڑتی تو وہ فوراً سورۃ النور کی آیت ۳۱ کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہاں بھی تو چہرے کے پردہ کا حکم نہیں' بلکہ رخصت موجود ہے اور صرف سینہ ڈھانپنے کا ذکر ہے' لہٰذا اگر کوئی عورت چہرہ نہیں ڈھانپتی تو اس پر چیں بجبیں ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مذکورہ اعتراض کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ النور کی مکمل آیت درج کردی جائے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۗ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (النور: ۳۱)

''(اے رسولؐ!) مؤمن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا

کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں' مگر جو از خود ظاہر ہو جائے' اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں' اور اپنی اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے خاوندوں سے' یا اپنے باپوں سے' یا اپنے خاوند کے باپوں (سسر) سے' یا اپنے بیٹوں سے' یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں (سوتیلے بیٹوں) سے' یا اپنے بھائیوں سے' یا بھائیوں کے بیٹوں (بھتیجوں) سے' یا بہنوں کے بیٹوں (بھانجوں) سے' یا اپنی (ہی قسم کی) عورتوں سے' یا اپنے لونڈی غلاموں سے' یا ان خدام سے جو عورتوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں' یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں' اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اُس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔''

یہ آیت سورۃ النور کی ہے اور سورۃ النور واقعہ اِفک کے بعد یعنی ۶ ہجری کے اواخر میں نازل ہوئی جبکہ سورۃ الاحزاب اس سے پہلے جنگ احزاب کے بعد یعنی ۵ ہجری کے اواخر میں نازل ہو چکی تھی۔ اور سوۃ الاحزاب کی روشنی میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کے ساتھ تمام مسلمان عورتوں کو چہرے کے پردہ کا حکم فرمایا ہے اور ابن عباس' ابن مسعود رضی اللہ عنہم' عبیدہ سلمانی' قتادہ' حسن' ابراہیم اور دیگر بے شمار صحابہ وصحابیات اور تابعین و تبع تابعین ''یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ'' سے چہرے کا پردہ ہی مراد لیتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ چہرے کا پردہ حجاب کے ذیل میں آتا ہے جو ستر سے مستزاد ایک ایسا حکم ہے جس کی پابندی کرتے ہوئے عورت کو غیر محرم سے پردہ کرنا پڑتا ہے اور خیر القرون میں حجاب کو شرعی حکم سمجھا جاتا تھا۔ اس ضروری پس منظر کے بعد ہم مذکورہ آیت کے حوالے سے ہوائی قلعہ تعمیر کرنے والوں کی آراء کا جائزہ لیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "اِلَّا مَا ظَھَرَ" سے مراد بعض صحابہ وتابعین نے چہرے اور ہاتھوں کو کھلا (یا بے پردہ) رکھنا مراد لیا ہے لہٰذا غیر محرم سے چہرے کا پردہ ضروری نہ ہوا۔ اگرچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور بعض تابعین و تبع تابعین نے "اِلَّا مَا ظَھَرَ" سے

چہرے کا کھلا رکھنا بھی مراد لیا ہے' مگر سوال یہ ہے کہ جب صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین کی بڑی جماعت نے چہرے کا پردہ ضروری قرار دیا ہے اور خود ابن عباسؓ سے '' یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ '' کی تفسیر میں واضح طور پر چہرے کا پردہ کرنا مروی ہے تو پھر یہ اختلاف کیوں پیدا ہوا؟

اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ پہلے پردے کا حکم نازل ہوا اور پھر سورۃ النور میں اسے منسوخ قرار دے دیا گیا تو اس کا کوئی قائل نہیں اور نہ ہی نسخ کی صورت کا یہاں اطلاق ممکن ہے۔ لہٰذا دونوں آیتیں محکم ہیں اور ظاہر ہے کہ محکم ہونے کی وجہ سے ان میں ٹکراؤ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان میں جمع و تطبیق دی جائے گی اور اس کی صورت یہ ہے کہ سورۂ احزاب میں تو حجاب کا حکم ہے اور یہاں (سورۂ نور میں) اس کی بعض رخصتوں کا ذکر ہے۔ یعنی یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فلاں فلاں لوگوں سے چہرے کے پردہ کی ضرورت نہیں اور ان میں محرم رشتہ دار' غلام' بچے اور عمر رسیدہ افراد شامل ہیں' جبکہ ان کے سوا ہر غیر محرم سے حجاب کرنا ضروری ہے۔ گویا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے مراد چہرہ بھی لیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ محرم رشتہ دار سے چہرہ چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں ستر کے احکام بیان کئے جا رہے ہیں نہ کہ حجاب کے' اور ستر و حجاب کے دائرۂ کار جب الگ الگ ہیں تو پھر انہیں ایک ہی زاویہ پر رکھ کر خلط مبحث کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟

اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ سے بعض صحابہ و تابعین وغیرہ نے چہرے کے پردہ کا استثناء مراد لیا ہے تو پھر ان کے مقابلے میں انہی کے پائے کی ان سے بڑی جماعت نے چہرے کے پردہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ پھر جمہوریت پسند ایسے موقع پر اقلیت کو ترجیح دینا پسند کریں گے یا اکثریت کو؟

ابن عباس ﷺ اگر بالفرض محرم رشتہ داروں کے علاوہ غیر محرموں سے بھی چہرے کے پردہ کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے تو یہ ان کی اسی طرح ایک منفرد رائے قرار دی جاسکتی ہے جس طرح متعہ اور بعض دیگر مسائل میں ان کی رائے منفرد تھی۔ پھر اس بنیاد

پر چہرے کے پردہ کی حرمت ہرگز ثابت نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ پردہ جائز ہے' واجب نہیں۔ پھر کیا احتیاط کا یہ تقاضا نہیں کہ پردہ بہر حال کیا جائے کیونکہ اس منفرد رائے کے مقابلہ میں قوی دلائل پردہ (حجاب) کے وجوب ہی پر دلالت کرتے ہیں!

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ اور انہی کی طرح عدم حجاب کا موقف رکھنے والے حضرات کی تائید اس حدیث سے ہوسکتی تھی جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر (رضی اللہ عنہما) اللہ کے رسول ﷺ کے پاس تشریف لائیں تو ان کے جسم پر باریک کپڑے تھے تو اللہ کے رسولؐ نے رُخِ اَنور پھیرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو پھر اس کے جسم سے اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آنا چاہئے'' اور آپؐ نے چہرے اور ہتھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ مگر حافظ فرماتے ہیں کہ ''ابوداؤد اور ابوحاتم رازی کے بقول یہ روایت مرسل ہے۔ خالد بن دریک راوی نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ سے نہیں سنی''۔ (تفسیر ابن کثیر' ج ۳' ص ۴۵۴) علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رہے کہ خالد بذاتِ خود مجہول راوی ہے۔ اس لئے جب یہ روایت ہی ثابت نہیں تو اس سے چہرے کے پردہ کی نفی کیسے ممکن ہے؟

اس طرح کی ایک اور ضعیف روایت پیش کی جاتی ہے کہ ''کسی بھی عورت کے لئے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہے' یہ جائز نہیں کہ وہ بعد از بلوغت اپنا چہرہ اور یہاں تک ہاتھوں (اس کے ساتھ ہی رسول اللہؐ نے نصف کلائی تک اشارہ کیا) سے زیادہ ظاہر کرے''۔ یہ روایت طبری (ح ۲۹۹۷۰) میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے' مگر حضرت عائشہؓ سے ابن جریج بیان کرتے ہیں جن کی حضرت عائشہؓ سے ملاقات ہی ثابت نہیں۔ اسی طرح قتادہ سے بھی منقطع سند سے مروی ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہی دانشور جو اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے ناقابل ثبوت روایات بھی پیش کرنے لگتے ہیں' اپنے موقف کے منافی صحیح سے صحیح تر روایات کو بھی یہ کہہ کر ردّ کر دیتے

ہیں کہ ''یہ تو لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں''۔

ان لبرل حضرات کو اپنی ''عقلیت'' پر بڑا ناز ہے۔ دیگر مسائل سے قطع نظر فی الحال مذکورہ مسئلہ ہی کی روشنی میں ان کی عقل کا بھی ذرا جائزہ لئے چلتے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ عورتیں غیر محرموں سے چہرے کی بجائے اپنا سینہ چھپالیں اتنا ہی کافی ہے۔ قرآن و سنت کے دیگر دلائل سے قطع نظر عقلی لحاظ سے بھی اس کا بودا پن ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اگر آپ شادی سے قبل اپنی ہونے والی بیوی کی شکل وصورت دیکھنا چاہتے ہوں' مگر آپ کو اس کا چہرہ نہ دکھایا جائے اور اس کی جگہ باقی تمام بدن' ہاتھ پاؤں وغیرہ دکھلا دیئے جائیں تو کیا آپ مطمئن ہو جائیں گے؟ ''عقل مند'' کا جواب تو نفی ہی میں ہوگا۔ کیونکہ چہرہ ہی تو تمام بدن سے زیادہ پُرکشش ہوتا ہے۔ اس کی مزید تائید اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ مندرجہ صورت ہی کے برعکس اگر آپ کو اس عورت کا صرف چہرہ ہی دکھا دیا جائے تو آپ کے لئے قطعی فیصلہ کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔ گویا اصل چیز تو چہرہ ہے اور اگر اسے ہی حجاب سے خارج کر دیا جائے تو پھر حجاب کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے!

اسی طرح متجددین کو ہر مسئلہ میں حکمت' علت' ضرورت' وجہ وغیرہ نکالنے کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں اگر غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو سینہ ڈھانپنے کا حکم کیوں دیا ہے تو اس کا جواب یا علت یا حکمت یا ضرورت یا توجیہہ یہی مناسب ہوسکتی ہے کہ اس سے غیروں کے نفسانی خیالات نہ بھڑکیں کہ جو برائی پر منتج ہو سکتے ہیں۔ اگر فی الواقع اس کی یہی حکمت و علت ہے تو اسے چہرے کے پردہ میں بالا ولیٰ موجود ہونا چاہئے' کیونکہ چہرہ تو سارے جسم سے زیادہ پُرکشش ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم سینے کی طرح شہوانی جذبات تو بھڑک ہی اٹھتے ہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ سینہ ڈھانپنا تو فرض ہو مگر چہرہ چھپانا فرض نہ ہو؟

مغربیت زدہ حضرات کو اس بات کا بھی بڑا احساس ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز اور کسی بھی تعبیر کو' قطع نظر اس سے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز' اچھی ہے یا بری' فوری طور پر ضرورت

مصلحت' مجبوری اور وقت کا تقاضا سمجھتے ہوئے اپنا لیا جائے۔اس پس منظر میں اگر یہ ''دانشور'' اس بات کا بھی احساس کر لیں کہ اگر بالفرض چہرے کا پردہ ضروری نہیں' صرف جائز ہی ہے' تو فحاشی و بے حیائی کے اس پُرفتن ماحول میں تو کم از کم بطورِ مصلحت اور سد الذریعہ کے طور پر اسے ضروری قرار دینا چاہئے' کیونکہ اصول فقہ کے معروف قاعدے کے مطابق اباحت کا درجہ رکھنے والی کسی بھی چیز کو سد الذریعہ کے تحت واجب یا حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرصورت اس تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ اگر بالفرض چہرے کے پردہ میں رخصت و اباحت بھی ہوتی تو آج کے پُرفتن دَور میں اسے عزیمت و فرضیت کا درجہ بھی مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں دیا جا سکتا ہے۔اور جب اسی اصول پر آنا ہے تو پھر پہلے ہی یہ تسلیم کیوں نہ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں چہرے کے پردہ کا وجوبی حکم موجود ہے اور ہمارا تو اسی پر یقین مستحکم ہے۔

گزشتہ بحث میں وجوبِ حجاب پر دلالت کرنے والی صحیح و مستند احادیث پیش کرنے سے قصداً اعراض کیا گیا ہے' کیونکہ ہمارے مخاطبین اس وقت ایسے لوگ ہیں جنہیں اپنے موقف کے منافی صحیح ترین حدیث بھی قبول نہیں۔ بہرحال احادیث حجاب کے حوالے سے ہم ایک ایسی صحیح روایت کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں پردے کی غیر معمولی اہمیت کے احساس کے ساتھ اس کے وجوب پر بھی براہِ راست روشنی پڑتی ہے۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے:

> ''عتبہ بن ابی وقاص (کافر) نے مرنے سے پہلے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص (مسلم جرنیل) کو وصیت کی تھی کہ ''زمعہ'' کی باندی کا بچہ میرا ہے' اس لئے تم اسے اپنے قبضہ میں لے لینا۔ پھر جب مکہ فتح ہوا تو حضرت سعد نے اس لڑکے کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی (عتبہ) کا بیٹا ہے اور انہوں نے اس کے متعلق مجھے وصیت کی تھی' جبکہ زمعہ کا بیٹا کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ یہ میرے باپ کی باندی کا لڑکا ہے اور میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ بالآخر دونوں حضرات یہ مقدمہ لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سعدؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ! یہ میرے بھائی کا لڑکا ہے اور انہوں نے

مجھے اس کے بارے میں وصیت کی تھی۔ پھر عبد بن زمعہ نے کہا کہ یہ لڑکا میرا بھائی ہے اور میرے باپ کی باندی کا بیٹا ہے اور میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے (دونوں بیان سننے کے بعد) فرمایا کہ اے عبد بن زمعہ! یہ لڑکا تمہارے پاس رہے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ بچہ اسی کا ہوگا جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لئے حدّ رجم ہے۔ پھر آپؐ نے حضرت سودہؓ (جو زمعہ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس لڑکے کی بہن بنتی تھیں اور آنحضرت ﷺ کی بیوی تھیں) سے فرمایا کہ ((اِحْتَجِبِیْ مِنْهُ یَاسَوْدَةُ)) "اے سودہؓ! اس لڑکے سے پردہ (حجاب) کرنا"۔ کیونکہ آپؐ اس لڑکے میں عتبہ کی مشابہت محسوس کرتے تھے۔ پھر حضرت سودہؓ کے پردہ کرنے کی وجہ سے اس لڑکے نے مرتے دم تک انہیں نہ دیکھا"۔ (بخاری' کتاب البیوع' ح ۲۰۵۳)

حضرت سودہؓ ازواج مطہرات میں شامل تھیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اُمت کی مائیں قرار دیتے ہوئے رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کسی اور سے نکاح کرنے سے منع فرمادیا۔ اس لحاظ سے حضرت سودہؓ اس لڑکے کی "ماں" بنتی ہیں اور زمعہ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے حضرت سودہؓ اس لڑکے کی قانونی بہن بھی بن چکی تھیں۔ گویا اس لحاظ سے وہ لڑکا حضرت سودہؓ کا محرم بنتا ہے' البتہ اس میں زمعہ کی بجائے عتبہ کی مشابہت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے انہیں بہن بنانے کے باوجود اس لڑکے (بھائی) سے پردہ کرنے کا حکم دیا (اس لئے یہ مسئلہ بیک وقت دو پہلو رکھتا ہے)۔ پھر حضرت سودہؓ نے اس پر عمل کرتے ہوئے زندگی بھر اس لڑکے سے چہرے کا پردہ کئے رکھا۔ علاوہ ازیں یہ ایسی حدیث ہے جس میں حجاب کا واضح طور پر حکم (امر) دیا گیا کہ اِحْتَجِبِیْ مِنْهُ اور حکم ہمیشہ وجوب پر دلالت کرتا ہے تاوقتیکہ وجوب سے بدلنے کے لئے کوئی قرینہ ہو۔ پھر یہ حکم اس طرح ہے جس طرح کسی بھی عورت کو غیر محرم سے چہرے کا پردہ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث کو حضرت سودہؓ کے ساتھ خاص قرار دے کر ردّ بھی نہیں کیا جاسکتا!

☆☆☆

محبتِ رسولؐ اور اُس کے عملی تقاضے

تحریر: عاتکہ علاؤ الدین

اُمت مسلمہ آج جس صورتِ حال سے دوچار ہے اور جن پستیوں میں گری ہوئی ہے' اُن کی تفاصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر صاحب نظر آگاہ ہے کہ عزت' وقار اور سربلندی کی چھت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ نہ صرف دنیاوی' بلکہ دینی لحاظ سے بھی یہ اُمت زوال سے دوچار ہے۔ موجودہ ماحول میں اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ لوگوں کو دین کی طرف بلایا جائے اور ان کے نظریات درست کیے جائیں' کیونکہ انگریز کی دوسوسالہ غلامی کی وجہ سے جہاں دوسری بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں ایک بہت بڑی اور بنیادی خرابی یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں کے دلوں سے محبت رسول ﷺ ختم کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی۔ علامہ اقبال نے ''ابلیس کا پیغام اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اِس کے بدن سے نکال دو!

چنانچہ لوگ اپنے طور پر محبت' اطاعت اور تعظیم وتوقیر کے پیمانے تراشنے لگے جو روحِ محمدیؐ سے خالی یعنی حقیقی محبتِ رسولؐ اور اس کے حقیقی تقاضوں سے خالی تھے۔ پیش نظر موضوع ''محبتِ رسول ﷺ اور اس کے عملی تقاضے'' کے لئے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا انتخاب کیا ہے:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

''پس جو لوگ ایمان لائے اس (نبی اُمی) پر' اور آپ کی تعظیم کی' اور آپ کی مدد کی اور پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا ہے آپ کے ساتھ' یہی لوگ ہیں

اصل میں کامیاب ہونے والے۔''

اب اس آیہ مبارکہ کی وضاحت مختلف حصوں میں پیش خدمت ہے۔ ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ﴾ گویا پہلی بات ''ایمان'' کی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ سے ہمارے تعلق کی پہلی اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں اور دل و جان سے یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور آپؐ ہی کو پورے عالم کے لئے ہادی و رہنما بنا کر بھیجا گیا۔

اس سلسلے میں تاریخ سے ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ ہو! حضرت حبیب بن زید انصاری ؓ کو رسول اللہ ﷺ نے مُسیلمہ کذاب کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اُس نے حضرت حبیبؓ سے دریافت کیا کہ تم محمدؐ کو کیا سمجھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے سچے رسول اور نبیٔ برحق ہیں۔ اس پر مسیلمہ کذاب نے کہا پھر میرے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یعنی میں بھی رسول ہوں' میری بھی رسالت کی گواہی دو! اس پر انہوں نے جواب دیا کہ میں بہرا ہوں' تمہاری بات میرے کانوں میں نہیں پہنچتی۔ مسیلمہ نے غضب ناک ہو کر جلادوں کو حکم دیا کہ اس کا ایک ایک جوڑ کاٹتے جاؤ اور ہر جوڑ پر میری رسالت کی گواہی کا اقرار کراؤ' اگر میری رسالت کی گواہی دے تو چھوڑ دو' لیکن اگر محمدؐ کے رسول ہونے کی گواہی دے تو اس کی بوٹی بوٹی کر دو۔ چنانچہ وہ جلاد اپنی بات کہتے رہے اور حضرت حبیبؓ ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ'' کہتے رہے یہاں تک کہ ان کے جسم کے تین سو ساٹھ ٹکڑے کر دیئے گئے' لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی پر آخر دم تک ڈٹے رہے۔ (رضی اللہ عنہ)۔

گویا یہ ہے اصل ایمان اور اس کا تقاضا۔ یعنی اقرار باللسان بھی ہو اور تصدیق بالقلب بھی۔ اور یہ تصدیق بالقلب تو بڑے بڑے تقاضے کرتی ہے اور یہی اصل و حقیقی ایمان ہے' کیونکہ محض زبان سے اقرار ہو اور دل میں ایمان نہ ہو تو یہ کھلی منافقت ہے۔ جیسے مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے آنحضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے' ساتھ روزے رکھتے تھے' زکوٰۃ بھی

دیتے تھے، لیکن دل نورِ ایمان سے خالی تھے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا ٹھکانہ از روئے قرآن مجید ﴿فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء:۱۴۵) قرار پایا۔ لہٰذا دنیا میں قانونی طور پر ہر مدعیٔ ایمان کو ''مسلمان'' تو مان لیا جائے گا، لیکن آخرت میں وہی شخص مؤمن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔ گویا ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط واشتراک سے ہوتی ہے۔

متذکرہ بالا آیت میں ''ایمان'' کے بعد جو شے مذکور ہوئی ہے وہ ''تعظیم'' ہے (وَعَــــزَّرُوْهُ) ـــــ اور یہ درحقیقت ایمان کا اوّلین تقاضا ہے۔ تعظیم، حقیقی محبت اور اطاعت، یہ تینوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ نیز تعظیم اور محبت کا حقیقی تقاضا اطاعتِ رسول ﷺ ہے جس کے دلائل آگے آ رہے ہیں۔ یہاں پہلے ''تعظیم'' پر گفتگو ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝﴾ (الحجرات:۲)
>
> ''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے بلند مت کرو اور نہ ان سے بات کرو تڑخ کر جیسے تڑختے ہو آپس میں۔ کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے اعمال اور تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہو۔''

اس آیت میں محض سوئے ادب کی وجہ سے سارے اعمال ضائع ہونے کی وعید ہے۔ تو سوچئے کہ خدانخواستہ معصیت رسول ﷺ کے نتائج کس قدر بھیانک و خوفناک ہوں گے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

> ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۝﴾ (البقرۃ:۱۰۴)

اس آیت میں چار باتیں بیان ہوئیں: راعنا نہ کہو، انظرنا کہو، بات غور سے سنو، اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ہر بات پر غور تو فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کے ادب واحترام کا کس قدر اہتمام فرما رہا ہے۔

اب ایمان بالرسالت کے دوسرے جزء یعنی حقیقی محبت کو لیجئے۔ حدیث نبویؐ ہے کہ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) [1]

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے اُس کے والدین' اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں''۔

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت تمام اعزہ واقارب اور دیگر تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص مؤمن نہیں ہے۔ اس ضمن میں حضرت عمرؓ کا بہت پیارا واقعہ ہمیں ملتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے سوال کیا کہ اے عمر! تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟ اس سوال کے انداز سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ آنحضور ﷺ اور حضرت عمرؓ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا اور کس قدر محبت واپنائیت پائی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جواباً عرض کیا کہ حضورؐ! آپ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔ آنحضور ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا کہ ''کیا اپنی جان سے بھی زیادہ؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا ''اَلْآنَ'' یعنی ہاں حضور! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپؐ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ حضرت عمرؓ کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو''۔

گویا خوب سوچ سمجھ کر اپنے اندر کا اور اپنے دل کا جائزہ لے کر جواب دیا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعووں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں' جبکہ عمل ندارد' اِلاّ ماشاء اللہ۔ اسی لئے قرآن مجید نے اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کو ہر چیز کی محبت پر ترجیح دی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبة: ٢٤)

(١) صحيح البخاري' كتاب الايمان' باب حب الرسول من الايمان

''آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے عزیز واقارب' اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو' تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے' اُس کے رسولؐ سے اور اُس کی راہ میں لڑنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم' اور اللہ رستہ (ہدایت) نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔''

ایمان بالرسالت کا تیسرا جزو ''اطاعت'' ہے:

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ﴾

(آل عمران:۳۲)

''کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مانو' اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا''۔

اِسی طرح مشکوٰۃ المصابیح کی حدیث ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ))[1]

''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائیں جو مَیں لے کر آیا ہوں۔''

اس حدیث کا معنی و مفہوم یہی ہے کہ دعوائے ایمان کے بعد احکام شریعت کے حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دلی آمادگی سے تسلیم کیا جانا جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن وسنّت کے ذریعے پیش فرمائے ہیں' یہی اطاعتِ رسولؐ ہے اور یہی اطاعت الٰہی ہے:

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ﴾ (آل عمران:۳۲)

''(آپؐ) فرما دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی۔''

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (التغابن:۱۲)

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔''

اور اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ وہ رسول کو بھیجتا ہی اس لئے ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ ارشاد ہوا:

(۱) رواہ فی شرح السنۃ

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:٦٤)

''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔''

اور

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:٨٠)

''جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لئے ہمارے پاس خود تو نہیں آتا' بلکہ اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لئے انبیاء و رُسل کو واسطہ بنایا۔ لہٰذا اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے' جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ)) (١)

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔''

نیز آنحضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لئے نصِ قطعی کے طور پر یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ (النساء:٦٥)

''سو قسم ہے آپؐ کے رب کی' یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپ ہی کو منصف جانیں اپنے باہمی اختلافات میں' پھر آپ جو فیصلہ کر دیں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور (آپ کی) پوری طرح فرماں برداری قبول کر لیں۔''

اب آیئے محبت رسول ﷺ اور اس کے عملی تقاضوں کا دوسرا حصہ دیکھیں۔ محبت رسولؐ اور تعظیم رسولؐ کا تقاضا صرف اور صرف اطاعتِ رسولؐ ہے۔ اطاعت رسولؐ کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ پہلے دو اجزاء کا مظہر ہے۔ یعنی اگر یہ اطاعت پائی جائے گی تو محبت اور تعظیم بھی پائی جائے گی' ورنہ نہیں۔ دلائل ملاحظہ ہوں:

---

(١) صحیح البخاری' کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة' باب الاقتداء بسنن رسول اللّٰه

ایک صحابیؓ پیارے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ! میں آپؐ کو اپنی جان اور بال بچوں سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں۔ اور جب میں گھر میں بال بچوں کے ساتھ ہوتا ہوں اور آپؐ کو یاد کرتا ہوں تو جب تک آپؐ کو دیکھ نہ لوں مجھے قرار نہیں آتا' تب میں واپس آپؐ کے پاس آجاتا ہوں' لیکن جب میں اپنی اور آپؐ کی موت کو یاد کرتا ہوں تو میں جان لیتا ہوں کہ جب آپؐ جنت میں داخل ہوں گے تو آپؐ نبیوں کے ساتھ بڑے بڑے درجات میں ہوں گے اور اگر میں جنت میں داخل ہوا بھی تو میں نہ آپؐ کو دیکھ سکوں گا اور نہ ہی آپؐ تک پہنچ سکوں گا' تو مجھے بڑی تکلیف ہوگی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾ (النساء:٦٩)

''اور جو اطاعت کریں اللہ اور رسول کی پس وہی ساتھ ہوں گے ان کے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا نبیوں میں سے اور صدیقین' شہداء اور صالحین میں سے' اور وہ کیا ہی خوب اچھے دوست ہیں۔''

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اگر کوئی شخص جنت میں جانے کا اور وہاں رسول اللہ ﷺ کی معیت کا خواہش مند ہو تو یہ صرف حقیقی اطاعت رسولؐ ہی سے ممکن ہے۔ وہ لوگ جو بغیر اطاعتِ رسولؐ کے جنتی ہونے کا خواب دیکھتے ہیں اور محبتِ رسولؐ کے زبانی دعوے دار ہیں' ان کا حال بزبانِ مصطفیٰ ﷺ ہی ملاحظہ فرمائیں:

((كُلُّ اُمَّتِیْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی)) قِيْلَ وَمَنْ اَبٰی؟ قَالَ: ((مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی)) (١)

''میرے تمام اُمتی جنت میں داخل ہوں گے سوائے اس کے جو (جنت میں جانے سے) انکار کرے''۔ عرض کیا گیا کہ کون انکار کرنے والا ہوگا؟ تو فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی

(١) صحيح البخاری' كتاب الجهاد' باب كيف يقاتل من وراء الامام ويتقی به.

پس اس نے (خود ہی جنت میں جانے سے) انکار کر دیا۔“

نہ صرف رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا آپؐ کی اطاعت ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا بھی آپؐ کی اطاعت ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آیت ۳۱)

”(اے نبیؐ! آپ لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔“

صحابہ کرام ؓ کو رسول اللہ ﷺ سے غایت درجہ کی محبت تھی' چنانچہ وہ کوئی کام آپؐ کے قول وفعل کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی اتباع آپؐ سے سچی محبت کی پہچان ہے۔ بیہقی میں حضرت عبدالرحمٰن بن ابی فراء ؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا۔ آپؐ کے صحابہ کرام ؓ نے وضو کے پانی کو (تبرکاً) اپنے جسموں پر ملنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا کہ کس چیز نے تمہیں اس کام پر آمادہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

”جسے یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھے یا اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھیں تو اُسے چاہئے کہ جب بولے سچ بولے اور جو امانت اس کے پاس رکھی جائے تو اس کو ادا کر دے اور ہمسایوں کے ساتھ ہمسائیگی کا حق ادا کرے۔“

آپ ﷺ کو جو چیز محبوب ہوتی صحابہ کرام ؓ کو بھی پسند ہوتی۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کو کدو بہت مرغوب و پسند تھا۔ اسی لئے حضرت انس بن مالک ؓ بھی اس کو نہایت پسند فرماتے تھے۔ ایک دن کدو کھا رہے تھے کہ خود بخود بول اٹھے کہ اے کدو! اس بنا پر کہ تو رسول اللہ ﷺ کو پسند ہے' مجھے بھی کس قدر محبوب ہے! (ترمذی' کتاب الاطعمہ)

آنحضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ)) (۱)

''جس نے میری سنت کو محبوب رکھا اس نے مجھ سے محبت کی' اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔''

بقول شاعر

محمدؐ کی جس دل میں الفت نہ ہو گی — سمجھ لو کہ قسمت میں جنت نہ ہو گی
کرے جو اطاعت محمدؐ کی دل سے — اسے پیر و مرشد کی حاجت نہ ہو گی
بھٹکتا رہا ہے' بھٹکتا رہے گا — محمدؐ سے جس کو عقیدت نہ ہو گی

اور یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے' لیکن دِل میں محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے اور یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا والی کیفیت نہیں ہے تو ایسا طرزِ عمل منافقین کے ساتھ مماثلت کا باعث بنتا ہے۔ اور اِسی طرح محبت کا دعویٰ تو ہے' لیکن اطاعت نہیں ہے تو یہ طرزِ عمل بھی منافقت کے زمرے میں ہی آئے گا۔ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے کہ کسی بیٹے کو اپنے والد سے محبت کا دعویٰ تو ہو لیکن وہ کام ایسے کرے جو اُن کی نافرمانی کے ہوں تو ظاہر ہے کہ بیٹے کے اِس دعوائے الفت و محبت کو دنیا میں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ بقول شاعر

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا لَّاَطَعْتَہٗ
اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٗ

(اگر تم کو اللہ کے رسولؐ کے ساتھ سچی محبت ہوتی تو تم اُن کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے۔ کیونکہ محبت کرنے والا اپنے محبوب کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔)

زیرِ مطالعہ آیت میں نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد ''وَنَصَرُوْہُ'' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی جن لوگوں نے حضور ﷺ کی نصرت وحمایت کی۔ یہاں آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الطعم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ و اجتناب البدع

نصرت وحمایت کس مقصد کے لئے مطلوب ومقصود ہے؟ دیکھئے نبوت ورسالت ایک فریضہ منصبی ہے جو اللہ کی طرف سے انبیاء ورُسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا' طاغوتی ظلمتوں سے نورِ ہدایت کی طرف بلانا اور انسانیت کو ''خسارے'' سے بچانا۔ نیز انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جس روز اُسے اپنے آقا وخالق کے سامنے محاسبے کے لئے کھڑا ہونا ہے:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (المطففين:٦)

''جس دن (تمام) لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

اور

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ (الانفطار:١٩)

''جس روز کوئی کسی کا کچھ بھلا نہ کر سکے گا اور حکم اس روز اللہ ہی کا ہوگا۔''

اور پھر جس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیشِ نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا' جنت اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔ بمطابق ارشادِ ربانی:

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى﴾ (النّٰزعٰت:٣٥ـ٤١)

''اور جس دن انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی۔ تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔ اور جس نے اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہش سے باز رکھا تھا تو جنت اُس کا ٹھکانہ ہوگی۔''

یہ تبلیغ کا بارِ گراں ہی تھا جو نبوت ورسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا اور اس کی خبر نبوت کے آغاز میں ہی دے دی گئی تھی کہ:

﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ (المزمل:۵)

''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے''۔

اور پھر یہ بوجھ چند ہی دنوں میں آپؐ پر ڈال دیا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ﴾ (المدثر:۱۔۳)

''اے چادر لپیٹنے والے! اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے۔''

گویا اس کا نام اور اس کا دین سب پر غالب آ جائے۔ وَکَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ـــــ لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ ـــــ اور مدنی دور میں اس کو مزید واضح کر دیا گیا کہ چونکہ آپؐ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں' لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہارِ دین حق اور غلبۂ دین مبین بھی آپؐ کے فرائض رسالت و نبوت میں شامل ہے اور یہ آپؐ کی بعثت کی اہم ترین کڑی بھی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الھدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ اسے غالب کر دے تمام ادیان پر۔''

پھر فرمایا:

﴿وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ ...... وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾

''خواہ کافروں کو یہ کیسا ہی ناگوار ہو...... خواہ مشرکوں کو یہ کیسا ہی ناگوار گزرے''۔

خواہ راستے میں کتنی ہی مشکلات آئیں' صعوبتیں پہنچیں' ظلم و تشدد کا بھیانک مظاہرہ ہو' تمام مخالفتوں' مظالم اور موانع کے باوجود حضور ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل تھا کہ وہ طاغوتی ظلمتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے تکبیرِ ربّ کا علم بلند رکھیں۔ اور پھر یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جس طرح آنحضور ﷺ کی زندگی میں ان کے اصحاب و انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے ان کا ساتھ دیا تھا اور ان کے دست و بازو بنے تھے اسی طرح اب ہر اُمتی پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی

میں رسول اللہ ﷺ کا رفیق و ناصر بنے۔ گویا اب ہمیں "تکبیر ربّ" کی کٹھن مہم میں، اقامت دین کے مشکل مرحلے میں اور دعوت و تبلیغ کی راہوں میں، حق و باطل کے معرکہ کارزار میں اور پھر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدان میں رسول اللہ ﷺ کا دست و بازو اور حامی و ناصر بننا ہوگا۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (الحدید:٢٥)

"اور تا کہ اللہ تعالیٰ دیکھ لے کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے۔"

اور اسی عظیم مقصد کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانی ہے کہ:

﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (الانعام:١٦٣)

"بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا ربّ ہے۔"

بقول شاعر ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اِسی لئے مسلماں میں اِسی لئے نمازی!

یہاں لفظ نصرت سے اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ کے نبی و رسول ﷺ کو کسی انسان کی مدد و حمایت کی کیا حاجت؟ پس اس نکتہ کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس عالم اسباب میں غلبۂ دین حق کے لئے جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو زمین میں اللہ کا خلیفہ قرار دیا گیا اور اس خلافتِ ارضی کے لئے انبیاء و رُسل کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج﴾ (الحدید:٢٥)

"یقیناً ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔"

اور پھر خیر و شر کی پہچان اور قبولِ حق کی استعداد ہر انسان میں رکھ دی۔ اور ساتھ ہی

آفاق و انفس کی آیاتِ الٰہیہ دعوتِ انبیاء و رُسل کے قبول کرنے میں انسان کی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ (الدھر:۳)

''ہم نے اسے دکھایا ہے (سیدھا) راستہ' اب چاہے شکر گزار بنے چاہے احسان فراموش۔''

اور پھر جو لوگ اس ''دعوتِ حق'' کو قبول کر لیں تو لازماً اس عالمِ اسباب میں دینِ حق کو پھیلانے اور غلبہ دین کی جدوجہد کے لئے مؤمنین صادقین کی سرفروشیوں کی ضرورت ہو گی۔ اور اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی واقعتاً قائم ہو گی تو ان ہی کی جدوجہد اور جہاد و قتال سے ہو گی۔ نیز راہِ حق میں جان کے نذرانوں سے ہی تائید و نصرتِ الٰہی کا ظہور ہو گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾(الصف:٤)

''بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

اور پھر انہی آزمائشوں سے پتہ چلے گا کہ:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ (العنکبوت:١١)

''اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون ہے ان میں سے ایمان والا اور جان لے کہ کون ہے منافق۔''

موجودہ دور میں معاشرہ برائیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر طرف ظلمت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کون سی برائی ہے جو آج نہیں پائی جاتی! اور پھر ان حالات میں اگر کوئی مدعیٔ عشقِ رسولؐ گھر بیٹھا درود و سلام کی تسبیح پڑھ رہا ہو تو کس قدر مضحکہ خیز بات ہو گی' جبکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نبی کریم ﷺ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری اُمت مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے　　نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پس اب مدعیٔ ایمان اور محبِ رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر جائزہ لینا ہوگا کہ وہ نصرتِ رسولؐ سے کس قدر وابستہ ہے؟ جبکہ آج عملاً یہ صورت حال ہو چکی ہے کہ ۔

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

لٰہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کے مصداق تمام اُمت مسلمہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دعوائے محبتِ رسولؐ کا حق ادا کرے' ورنہ خدانخواستہ اگر موجودہ صورت حال (بحثیت مجموعی) برقرار رہی تو ایسے ہی نافرمانوں کے لئے قرآن مجید فرماتا ہے کہ:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (النور:٦٣)

''سو ڈرتے رہیں وہ لوگ جو خلاف کرتے ہیں اُس کے حکم کا اس سے کہ آن پڑے اُن پر کچھ خرابی یا پہنچے ان کو عذاب دردناک۔''

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۳۲)

''کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' لیکن اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا''۔

نیز سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:١١٥)

''اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی اس کے بعد کہ کھل چکی اُس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اُس کو اُسی طرف جو اُس نے اختیار کی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں' اور وہ بہت بری جگہ پہنچا''۔

اب آیت کا اگلا حصہ لیجئے جو نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد فراہم کرتا ہے: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ ''اور اتباع کی انہوں نے اُس نور کی جو محمد (ﷺ) کے ساتھ نازل کیا گیا''۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکی ہیں کہ ﴿اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ﴾ وہ انتہائی جامع تھیں' تو چوتھی بات کا اضافہ خصوصی طور پر کس مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے؟ تو یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ اس لئے ضروری تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابد الآباد تک قرآن مجید ہی کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا۔ بقولِ اقبال:

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں

مزید برآں خطبہ حجۃ الوداع میں آنحضور ﷺ نے جو آخری بات ارشاد فرمائی تھی وہ بھی قرآن ہی کے بارے میں تھی کہ:

((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ : کِتَابُ اللّٰهِ))(۱)

''میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جس کو اگر تم تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ''۔

اور اسی طرح قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا کہ:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ......﴾(آل عمران:۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا''

اور یہ ''حبل اللہ'' از روئے فرمودات رسول کریم ﷺ قرآن مجید ہی ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مبارک بھی نقل ہوئے ہیں کہ ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ)) ''یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ اور اسی طویل حدیث میں قرآن مجید کی شان میں وارد ہونے والے یہ الفاظ نہایت اہم ہیں کہ:

''قرآن مجید وہ کتاب ہے کہ جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اِس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہو گا اور نہ ہی اس

(۱) مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ

کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔'' (ترمذی)

اب اِن تمام احکامات وفرمودات کے برعکس ہماری حالت زار یہ ہے کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

ذرا تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ کو تھامے رکھا تب تک وہ غالب رہے اور پرچم اسلام بلند رہا۔ لیکن جوں جوں قرآن وسنت سے دور ہوتے گئے توں توں حالات بگڑتے گئے' یہاں تک کہ آج موجودہ صورت حال سب کے سامنے ہے کہ کس طرح اُمت مسلمہ غلام بن کر رہ گئی ہے۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۝﴾ (آیت ۳۰)

''اور رسول عرض کرے گا اے میرے ربّ! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن مجید کو چھوڑ رکھا تھا''۔

اگرچہ سیاق وسباق کے اعتبار سے یہاں وہ کافر مراد ہیں جن کے نزدیک قرآن مجید کوئی الہامی کتاب نہیں تھی' تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن سے دُور ہیں اور جنہوں نے ساری عمر نافرمانیوں میں گزاری' باوجود اِس کے کہ ان کے پاس محفوظ ترین الہامی کتاب اور پھر اس کے احکامات پر عمل کرنے اور صراط مستقیم پر چلنے کے لئے خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی خبریں بھی محفوظ حالت میں پہنچیں اور پھر بھی انہوں نے اس سے رُخ موڑا۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))[1]

''اللہ تعالیٰ اس کتاب عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت بخشے گا اور دوسروں کو اس (کتاب کو چھوڑنے) کے باعث ذلت سے دوچار کرے گا''۔

اور اِسی سلسلے میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (جنہیں ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دوران حکومت

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ وفضل من تعلم حکمۃ

برطانیہ نے مالٹا میں اسیر کر دیا تھا) کا ایک فرمان ملاحظہ ہو جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تالیف ''وحدتِ اُمت'' میں نقل کیا ہے کہ:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ مسلمان دینی و دنیاوی ہر لحاظ سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے' ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے' بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے انہیں آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے''۔

اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ جہاں ہم نے قرآن سے کنارہ کشی اختیار کی وہاں ہمارا نصب العین' ہماری جدوجہد اور ہماری قوتوں کا مصرف محض دنیا ہی ہو گئی۔ اور ایسے منافقوں کا حال قرآن مجید کچھ یوں بتاتا ہے کہ:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۞ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۞ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۞﴾ (الفرقان: ۲۷۔۲۹)

''اور اُس دن ستم گر اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا ہائے کاش کہ میں نے رسول کی راہ لی ہوتی۔ ہائے افسوس کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا کہ اس نے تو مجھے اس کے بعد گمراہ کر دیا کہ نصیحت میرے پاس آ پہنچی تھی۔ شیطان تو انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔''

آج ہم دنیا میں ذلت و رسوائی کا مرقع بنے ہوئے ہیں' رہا اُخروی عذاب تو اُس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے قرآن مجید کو پسِ پشت ڈالنے اور سنتِ رسول ﷺ کو چھوڑنے کا' حالانکہ ہمیں تو حکم ہوا تھا کہ:

((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ ، وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ، وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (رواہ البیہقی)

''اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنالینا' بلکہ رات اور دن کے لمحات میں اس کی اس طرح تلاوت کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اسے پھیلاؤ' اور اسے خوش الحانی سے پڑھا کرو' اور اس میں غور وفکر کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔''

ایک اور حدیثِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے:

''پس تم خوشیاں مناؤ کہ قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے نہ کبھی گمراہ''۔ (طبرانی)

الغرض حاصلِ کلام یہ ہے کہ محض زبانی کلامی عشقِ رسولؐ کے دعوے کر لینا کفایت نہیں کرے گا' جب تک کہ من حیث القوم پوری اُمت اپنا قبلہ درست نہ کرے۔ بقول اقبالؔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں!

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے رستے میں قبول فرمائے اور دُنیوی و اُخروی فوز وفلاح عطا فرمائے! (آمین ثم آمین)

کتابیات

۱) ڈاکٹر اسرار احمد: نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں
۲) ڈاکٹر اسرار احمد: اسوۂ رسول ﷺ
۳) ڈاکٹر اسرار احمد: عظمتِ مصطفیٰ ﷺ
۴) ڈاکٹر اسرار احمد: رسولِ کامل ﷺ
۵) مولانا عبدالسلام بستویؒ: اسلامی خطبات

مسلمان کا طرزِ حیات (۳۵)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنھاجُ المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاخلاق

ساتواں باب

شرم وحیا

مسلمان پاک دامن اور باحیا ہوتا ہے اور شرم وحیا اُس کے امتیازی اخلاق میں سے ہے' کیونکہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ اور ایمان ہی تو ایک مسلمان کا عقیدہ اور زندگی کی اہم ترین چیز ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ اَوْ بِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً ' فَاَفْضَلُهَا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ' وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِیْمَانِ)) [1]

"ایمان کی ستر سے زیادہ —— یا یوں فرمایا: ساٹھ سے زیادہ —— شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل شاخ لا الٰہ اِلاّ اللہ کا اقرار ہے اور سب سے ادنیٰ شاخ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔"

ایک حدیث میں ارشاد ہوا:

((اَلْحَیَاءُ وَالْاِیْمَانُ قُرَنَاءُ جَمِیْعًا ' فَاِذَا رُفِعَ اَحَدُهُمَا رُفِعَ الْاٰخَرُ)) [2]

"حیا اور ایمان دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک چیز اٹھ جائے تو دوسری بھی اُٹھ جاتی ہے۔"

۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب امور الایمان (مختصراً)۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان وافضلها وادناها وفضیلة الحیاء وکونه من الایمان۔

۲) مستدرك حاکم' کتاب الایمان' ج۱' ص۲۲۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے۔

حیا کے ایمان کی شاخ ہونے میں راز یہ ہے کہ ایمان مؤمن کو نیکیاں کرنے اور گناہوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے اور حیا بھی انسان کو احسان کرنے والے کے شکر میں کوتاہی کرنے سے اور حق دار کے حق میں کمی کرنے سے روکتی ہے۔ اسی طرح حیا انسان کو مذمت اور ملامت کا خوف دلا کر بُرے کام کے ارتکاب سے روک دیتی ہے۔ اسی وجہ سے حیا خود بھی خیر ہے اور صرف خیر اور نیکی ہی کا باعث بنتی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَلْحَیَاءُ لَا یَاْتِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ))[1]

''حیا تو محض خیر ہی لاتی ہے۔''

اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ))[2]

''حیا سب کی سب خیر ہے۔''

عربی زبان میں ''حیا'' کے مقابلہ میں ''بذاء'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ''بذاء'' کے مفہوم میں زبانی اور عملی طور پر حیا کے منافی امور' اور بات کرنے میں سختی اور بے لحاظی شامل ہے۔ فحش گوئی ایک مسلمان کی عادت نہیں ہوتی' نہ وہ تکلفاً فحش گوئی کر سکتا ہے' نہ وہ سنگ دل' بے وفا اور بے لحاظ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تو جہنمیوں کی عادات ہیں اور مسلمان ان شاء اللہ جنتی ہے۔ لہٰذا بے شرمی اور تند خوئی اس کی عادت نہیں ہوتی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ وَالْاِیْمَانُ فِی الْجَنَّۃِ ' وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِی النَّارِ))[3]

''حیا ایمان میں شامل ہے اور ایمان جنت میں جائے گا۔ اور بدزبانی تند خوئی میں سے ہے اور تند خوئی جہنم[4] میں جائے گی۔''

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحیاء۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان...... الخ

۲) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان...... الخ

۳) سنن الترمذی' کتاب البر والصلۃ' باب ما جاء فی الحیاء۔ ومسند احمد' ج۲' ص ۵۰۱

٤) یعنی یہ عادت جہنم ہی کے لائق ہے اور انسان کو بھی جہنم میں لے جائے گی' جس طرح ایمان جنت میں لے جائے گا۔

اس عظیم خوبی میں مسلمان کے لئے بہترین نمونہ جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہے جو ایک پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔[1] حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر حضور ﷺ کو کوئی چیز (بات یا حرکت) ناگوار گزرتی تو ہمیں آنحضور ﷺ کے چہرۂ مبارک سے اس کا علم ہو جاتا''۔[2]

مسلمان جب دوسروں کو بھی حیا کی عادت قائم رکھنے اور اسے ترقی دینے کی طرف بلاتا ہے تو وہ اصل میں ایک عظیم بھلائی اور بڑی نیکی کی طرف بلا رہا ہوتا ہے' کیونکہ حیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان تمام خوبیوں کی اساس اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا گزر ایک شخص کے پاس سے ہوا' وہ حیا کے متعلق اپنے بھائی کو نصیحت کر رہا تھا (کہ اتنی زیادہ حیا نہ کیا کرو)۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيْمَانِ))[3]

''اسے چھوڑ دو' کیونکہ حیا ایمان کا حصہ ہے۔''

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اسے یہ حکم دیا کہ مسلمان کو حیا پر قائم رہنے دے اور اس کی حیا ختم نہ کرے' اگرچہ اس کے نتیجہ میں وہ اپنے بعض حقوق حاصل کرنے سے محروم رہ جائے۔ کیونکہ انسان کے کچھ حقوق ضائع ہو جانا کہیں بہتر ہے اس حیا سے محروم ہو جانے سے جو اُس کے ایمان کا جزو اور انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے' اور جس کی وجہ سے اسے بہت سے افراد پر نیکی میں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ کتنی عظیم تھیں وہ خاتون جن کا بچہ گم ہو گیا' اس نے چند مَردوں سے اپنے بچے کے متعلق پوچھا تو ایک شخص بولا: دیکھو یہ عورت اپنے بچے کو تلاش کرتی پھر رہی ہے اور اس حال میں بھی پردے کا کتنا خیال کر رہی ہے؟ عورت نے جواب دیا: ''میرے لئے بیٹے کی گمشدگی حیا

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحیاء

۲) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب کثرة حیائہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۳) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحیاء ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان عدد شعب الایمان ...... الخ (مسلم کی روایت میں یہ لفظ نہیں ''اسے چھوڑ دو'')۔

کھو بیٹھنے سے بہتر ہے''۔

مسلمان کے لئے حیا حق گوئی یا طلبِ علم کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ ایک بار جناب رسول اللہ ﷺ کے چہیتے صحابی اسامہ رضی اللہ عنہ (جن کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو بہت محبت تھی) نے رسول اللہ ﷺ سے ایک خاتون کے متعلق سفارش کر دی (کہ انہیں ان کے جرم کی سزا نہ دی جائے) تو آنحضرت ﷺ اسامہ رضی اللہ عنہ کو تنبیہ کرنے سے نہیں شرمائے' بلکہ انہیں غصہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

((اَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ يَا اُسَامَةُ، وَاللّٰهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا))(۱)

''اُسامہ! تم اللہ کی مقرر کردہ حد کے بارے میں شفاعت کرتے ہو؟ قسم ہے اللہ کی! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کر بیٹھتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

حضرت اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا کو ایک مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پیش آئی تو ایسا نہیں ہوا کہ حیا کی وجہ سے انہوں نے مسئلہ نہ پوچھا ہو' بلکہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سچی بات سے شرم نہیں کرتا۔ (مجھے یہ بتائیے) اگر عورت خواب میں ناپاکی دیکھے تو کیا اس پر بھی غسل فرض ہے؟ جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی مسئلہ بتانے میں شرم نہیں فرمائی' بلکہ ارشاد فرمایا: ''ہاں' اگر پانی نظر آئے''۔ (یعنی اگر جاگنے پر کپڑوں میں ناپاکی کا اثر نظر آئے تو غسل کرے)(۲)

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں زیادہ مہر باندھنے سے منع فرمایا۔ ایک عورت نے کہا: عمر! اللہ ہمیں دیتا ہے اور آپ منع کرتے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (اگر تم نے کسی عورت کو ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو)۔ حیا نے اس

۱) صحیح البخاری' کتاب الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل (نحوہ)
۲) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب الحیاء فی العلم۔ وصحیح مسلم' کتاب الحیض' باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منھا۔

خاتون کوعورتوں کے حقوق کا دفاع کرنے سے نہیں روکا۔ اور حضرت عمر ﷛ نے بھی سچی بات ماننے میں حیا نہیں کی' بلکہ فوراً معذرت کی اور فرمایا: ''عمر! تجھ سے سب لوگ زیادہ عالم ہیں''۔

ایک بار حضرت عمر ﷛ خطبہ دے رہے تھے اور آپ ﷛ نے ایک جیسے دو کپڑے (تہہ بند اور چادر) پہنے ہوئے تھے۔ آپ ﷛ نے فرمایا: ''لوگو! سنو اور تعمیل کرو''۔ ایک مسلمان فوراً بول پڑا: ''عمر! ہم آپ کی بات نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے' آپ نے دو کپڑے لے لئے ہیں جبکہ ہمیں ایک ایک کپڑا ملا ہے''۔ عمر ﷛ نے اپنے بیٹے عبد اللہ ﷛ کو آواز دی۔ انہوں نے کہا: ''ابا جان میں حاضر ہوں''۔ فرمایا: ''تمہیں اللہ کی قسم ہے (سچ بتاؤ!) کیا ان دو کپڑوں میں ایک تمہارا نہیں ہے جو تم نے مجھے دے دیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہی بات ہے''۔ معترض نے کہا: ''عمر! اب ہم آپ کی بات سنیں گے اور آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے''۔ دیکھئے! حیا اس شخص کو بات کرنے سے مانع نہیں ہوئی اور نہ عمر ﷛ نے صحیح بات ماننے میں حیا کی۔

مسلمان انسانوں سے بھی حیا کرتا ہے' ان کے سامنے جسم کے پوشیدہ حصے نہیں کھولتا' ان کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا' ان کے احسانات کا انکار نہیں کرتا' انہیں برے انداز سے مخاطب نہیں کرتا' اور نہ انہیں بری بات کہتا ہے۔ اسی طرح مسلمان اللہ سے بھی حیا کرتا ہے۔ اس کی اطاعت میں کوتاہی نہیں کرتا۔ اس کی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور اس کی ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷛ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہوتا ہے:

''اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ ' فَاحْفَظُوا الرَّأْسَ وَمَا وَعٰى ' وَالْبَطْنَ وَمَا حَوٰى ' وَاذْكُرُوا الْمَوْتَ وَالْبَلَاءَ '' (۱)

---

۱) منذری نے اس حدیث کو مرفوع روایت کیا ہے اور فرمایا ہے: زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ جامع الترمذی' کتاب صفة القیامة' باب ۲٤ (مرفوعاً)

''اللہ سے کما حقہ حیا کرو۔ سر اور اس میں موجود (خیالات) کا دھیان رکھو' پیٹ اور اس میں جانے والی (خوراک) کا خیال رکھو۔ موت کو اور مٹی ہو جانے کو یاد رکھو۔''

آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد اس کے پیش نظر رہتا ہے:

((اَللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُسْتَحْيَا مِنْهُ مِنَ النَّاسِ)) (۱)

''لوگوں کی نسبت اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔''

کتاب الاخلاق

آٹھواں باب

احسان اور حسنِ سلوک

مسلمان حسن سلوک محض اس لئے نہیں اپناتا کہ وہ اخلاقِ حسنہ میں سے ہے' بلکہ وہ اس لئے بھی اسے اختیار کرتا ہے کہ وہ اس کے عقیدہ و ایمان کا ایک حصہ اور اس کے اسلام کا ایک اہم جزو ہے۔ اصل میں دین اسلام بنیادی طور پر تین امور سے مرکب ہے: ایمان' اسلام اور احسان۔ جس طرح کہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جناب جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے اسلام' ایمان اور احسان کے متعلق دریافت فرمایا اور آنحضرت ﷺ نے تفصیل سے بیان فرمایا۔ اور جب جبریل علیہ السلام واپس تشریف لے گئے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبریل تھے' جو تمہیں تمہارے دین کی باتیں بتانے آئے تھے''۔ (۲) چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان تینوں چیزوں کو ''دین'' کے نام سے

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الغسل' باب من اغتسل عریانا وحدہ فی الخلوۃ ومن تستر والتستر افضل (ذکرہ فی ترجمۃ الباب) پوری حدیث جامع الترمذی' کتاب الادب' باب ما جاء فی حفظ العورۃ۔

۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام ......الخ اس روایت میں یہ الفاظ ہیں ''یہ جبریل تھے جو لوگوں کو اُن کا دین سکھانے آئے تھے''۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام...... الخ۔ اس میں یہ الفاظ ہیں ''یہ جبریل تھے' تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

ذکر فرمایا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر احسان کا حکم دیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے:

﴿وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرة:١٩٥)

''اور احسان کرو' اللہ تعالیٰ یقیناً احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ......﴾ (النحل:٩٠)

''اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے......''

نیز فرمایا:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا......﴾ (البقرة:٨٣)

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ﴾ (النساء:٣٦)

''اور والدین سے حسن سلوک کرو' اور رشتہ داروں سے' یتیموں سے' مسکینوں سے' قرابت دار ہمسائے سے' اجنبی ہمسائے سے' ہم نشین ساتھی سے' مسافر سے اور اپنے ہاتھوں کی ملکیت (لونڈی' غلاموں اور زیر دستوں) سے (حسن سلوک کرو)۔''

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ' فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ' وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَ' وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ فَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهُ)) (١)

''اللہ تعالیٰ نے (تم پر) ہر چیز سے حسن سلوک کرنا فرض کر دیا ہے۔ تو جب تم قتل کرو تو اچھے انداز سے قتل کرو' اور جب (کسی جانور کو) ذبح کرو تو اچھے انداز سے ذبح کرو' آدمی کو چاہئے کہ اپنی چھری تیز کر لے پس (اس طرح)

١) صحیح مسلم' کتاب الصید والذبائح' باب الامر باحسان بالذبح والقتل وتحدید الشفرة۔

ذبح ہونے والے جانور کو آرام پہنچائے (تاکہ جلدی جان نکل جانے کی وجہ سے اسے کم سے کم تکلیف ہو)۔''

عبادت میں ''احسان'' (اچھے انداز سے ادائیگی) کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو عبادت بھی ادا کرے' خواہ نماز ہو' روزہ ہو' حج ہو یا کوئی اور عبادت ہو' اسے صحیح طریقے سے ادا کرے۔ اس کی شرطوں کا پوری طرح خیال رکھے' اس کے ارکان مکمل طور پر ادا کرے' اور اس کے سنن اور آداب کو پورے طور پر پیش نظر رکھے۔ بندے کو یہ مقام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب عبادت کی ادائیگی کے دوران اسے اس بات کا شدید احساس رہے کہ وہ اللہ کی نگرانی میں ہے۔ اور یہ احساس اتنا قوی ہو گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ بندے کی نظروں کے سامنے ہے۔ ورنہ کم از کم اپنے قلب و ذہن کو یہ احساس تو دلائے کہ وہ اللہ کی نظروں میں ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دل کی ہر کیفیت اور جسم کی ہر حرکت سے باخبر ہے۔ اس طرح بندہ اپنی عبادت کو بہتر بنا کر مطلوب انداز سے ادا کر سکتا ہے۔ حدیث مبارک میں آنحضرت ﷺ نے اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

((اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ))(۱)

''احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے' اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔''

جہاں تک بندوں سے احسان اور حسن سلوک کا تعلق ہے تو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بات مانی جائے' انہیں ہر طرح سے آرام اور راحت پہنچانے کی کوشش کی جائے' انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچنے دی جائے' ان کے لئے دعائیں کی جائیں اور اللہ سے ان کی غلطیوں کی معافی کی درخواست کی جائے' اگر انہوں نے کسی سے کوئی وعدہ کیا ہے تو وہ وعدہ پورا کیا جائے اور ان کے دوستوں کا احترام کیا جائے۔

اقارب اور رشتہ داروں سے حسن سلوک یہ ہے کہ ان کا بھلا کیا جائے' ان پر رحم و

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی (ﷺ) عن الایمان والاسلام والاحسان ...... الخ۔

شفقت کا سلوک کیا جائے' ان سے ایسا رویہ رکھا جائے جو اُن کی عزت کے شایان ہو' ان سے گفتگو میں یا کسی کام کے دوران بدسلوکی کا انداز نہ اپنایا جائے اور ہر اُس حرکت سے پرہیز کیا جائے جس سے انہیں ذہنی اور قلبی طور پر تکلیف پہنچے۔

یتیموں سے حسن سلوک اس طرح ہوتا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کی جائے' ان کے حقوق کی پاسداری کی جائے' ان کی صحیح تربیت کی جائے' انہیں تکلیف نہ دی جائے' ان پر سختی نہ کی جائے' ان سے خندہ پیشانی سے بات کی جائے اور ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا جائے۔ غریب اور مسکین افراد سے حسن سلوک کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی خوراک اور لباس کی ضروریات پوری کی جائیں اور دوسروں کو بھی ان سے تعاون کی ترغیب دی جائے' ان کی عزتِ نفس کو مجروح نہ کیا جائے' ان کی تحقیر نہ کی جائے' انہیں تنگ نہ کیا جائے اور کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو انہیں ناگوار گزرے۔

مسافر سے حسن سلوک کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ضرورت پوری کی جائے' اگر اسے مالی تعاون کی ضرورت ہو تو مہیا کیا جائے' اس کے مال کی حفاظت کی جائے' اس کی عزت کا خیال رکھا جائے۔ اگر اسے راستہ معلوم نہ ہو تو راستہ بتایا جائے' اور اگر کسی اور معاملے میں اسے رہنمائی کی ضرورت ہو تو اسے صحیح مشورہ دیا جائے۔

خادم اور ملازم سے حسن سلوک یہ ہے کہ اسے پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت ادا کی جائے۔ اس سے وہ کام انجام دینے کا مطالبہ نہ کیا جائے جو اس کے فرائض منصبی میں شامل نہیں۔ اسے وہ کام کرنے کا حکم نہ دیا جائے جسے انجام دینا اس کے بس سے باہر ہو' یا جس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہو۔ اگر وہ گھریلو ملازم ہے تو اسے اس معیار کا کھانا اور لباس مہیا کیا جائے جیسا گھر کے افراد کو مہیا کیا جاتا ہے۔

عام لوگوں سے حسن سلوک یہ ہے کہ ان سے نرمی سے بات کی جائے۔ اور بات چیت کرتے ہوئے اور دیگر معاملات میں بھی اچھا انداز اختیار کیا جائے' البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے۔ اگر کوئی راستہ بھول جائے تو اسے راستہ بتایا جائے۔ جو دین کے احکام سے ناواقف ہے اسے ان مسائل کی تعلیم دی جائے' ان کے

ساتھ انصاف پر مبنی رویہ رکھا جائے‘ ان کے حقوق کو تسلیم کیا جائے‘ انہیں تنگ نہ کیا جائے اور ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے انہیں تکلیف ہو یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

جانوروں سے حسن سلوک اور احسان کا مطلب یہ ہے کہ انہیں خوراک مہیا کی جائے‘ بیمار ہوں تو علاج کیا جائے‘ ان سے ان کی طاقت سے بڑھ کر کام نہ لیا جائے‘ کام کے دوران ان سے نرمی کی جائے اور وہ تھک جائیں تو انہیں آرام کا موقع دیا جائے۔

عام جسمانی اعمال میں احسان کا مطلب یہ ہے کہ کام اچھے طریقے سے اور عمدہ معیار کے مطابق انجام دیا جائے اور ہر کام میں دوسروں کو دھوکا دینے سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱)

''جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

یہاں احسان کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) جنگ اُحد کے موقع پر مشرکین نے جناب رسول اللہ ﷺ کو جو تکلیفیں پہنچائی تھیں وہ وضاحت کی محتاج نہیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نہ صرف شہید کیا بلکہ ان کی لاش کی بے حرمتی بھی کی۔ آنحضور ﷺ کا چہرۂ انور زخمی ہوا اور دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ اس موقع پر ایک جاں نثار صحابی نے عرض کیا: حضور! ان ظالم مشرکوں کے لئے بددعا کیجئے‘ تو رحمۃ للعالمین ﷺ کی زبان مبارک سے یہی الفاظ نکلے:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ))

''اے اللہ! میری قوم کی بخشش فرما دے‘ کیونکہ یہ علم نہیں رکھتے''۔

(۲) خلیفۃ المسلمین جناب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خادمہ سے کہا: ''مجھے پنکھا جھلو‘ میں سونا چاہتا ہوں''۔ وہ (پنکھا) جھلنے لگی اور آپؒ سو گئے۔ اس کے بعد خادمہ کو بھی نیند آ گئی۔ آپؒ کی آنکھ کھلی تو دیکھا خادمہ سو رہی ہے۔ آپؒ نے پنکھا لے کر خادمہ کو جھلنا شروع کر دیا۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امیر المؤمنین

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب قول النبی ﷺ: ((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا))

اسے پنکھا جھل رہے ہیں۔ وہ پریشان ہوگئی۔ آپؒ نے فرمایا: ''تم بھی تو میری طرح ایک انسان ہی ہو۔ جس طرح مجھے گرمی لگتی ہے تمہیں بھی لگتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا جس طرح تم نے مجھے پنکھا جھلا ہے میں بھی تمہیں جھل دیتا ہوں''۔

(۳) ایک بزرگ کو اپنے ایک غلام پر سخت غصہ آیا اور اسے سزا دینے کا ارادہ فرمایا۔ غلام نے کہا: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ...... ﴾ ''اور غصہ پی جانے والے......''۔ فرمایا: ''میں نے غصہ پی لیا''۔ غلام نے کہا: ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾ ''اور لوگوں کو معاف کرنے والے''۔ ارشاد فرمایا: ''میں نے تجھے معاف کر دیا''۔ اس نے کہا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۱۳۴) ''اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''۔ انہوں نے فرمایا: ''جاؤ! تم اللہ کی راہ میں آزاد ہو''۔

کتاب الاخلاق
نواں باب

سچائی

مسلمان سچا ہوتا ہے' سچ سے محبت رکھتا ہے' اور اپنے تمام اقوال وافعال میں ظاہراً اور باطناً سچ اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے۔ اور ایک مسلمان کی بڑی سے بڑی تمنا اور بلند ترین مقصود جنت کا حصول ہی تو ہے۔ سچ کے برعکس عمل جھوٹ کہلاتا ہے' وہ گناہ کا راستہ دکھاتا ہے اور گناہ جہنم میں لے جاتا ہے اور ایک مسلمان کے لئے جہنم سے بڑھ کر خوفناک کوئی چیز نہیں ہو سکتی' اس سے بچنے کے لئے وہ جتنی بھی کوشش کرے بجا ہے۔

مسلمان سچائی کو محض ایک اخلاقی خوبی ہی نہیں سمجھتا جسے اختیار کرنا ایک شریف آدمی کے لئے ضروری ہے' بلکہ وہ اسے ایمان کا حصہ اور اسلام کی تکمیل کا باعث سمجھتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور اسے اختیار کرنے والوں کی تعریف

فرمائی ہے۔ اس کی ترغیب دلائی ہے اور اسے اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ اسی طرح جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کی طرف بلایا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۝﴾ (التوبة:١١٩)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

سچ بولنے والوں کی تعریف میں ارشاد ہوا:

﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ﴾ (الاحزاب:٢٣)

''وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا سچا کیا۔''

اور فرمایا:

﴿وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ......﴾ (الاحزاب:٣٥)

''سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں۔''

اور فرمایا:

﴿وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝﴾ (الزمر:٣٣)

''اور جو سچ لے کر آیا اور اس کی تصدیق کی یہی لوگ پرہیز گار ہیں۔''

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَاِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ اِلَى الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ اِلَى الْجَنَّةِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا' وَاِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ' فَاِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ اِلَى الْفُجُوْرِ' وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ اِلَى النَّارِ' وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا)) (١)

''سچ اختیار کرو' کیونکہ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت میں لے جاتی ہے۔ اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کا متلاشی رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو' کیونکہ جھوٹ گناہ کا راستہ دکھاتا ہے

---

١) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة' باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله۔ وصحیح البخاری' کتاب الادب' باب قول الله :﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ وما ينهى عن الكذب۔

اور گناہ جہنم میں لے جاتا ہے۔اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا متلاشی رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔''

سچ کے بہت سے فوائد ہیں جن سے سچ بولنے والا مستفید ہوتا ہے۔مثلاً:

(۱) ضمیر کا اطمینان اور سکون۔جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ)) (۱)

''یقیناً سچ اطمینان ہے۔''

(۲) کمائی میں خیر و برکت۔جناب خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا ' فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا ' وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا)) (۲)

''خریدنے اور بیچنے والے کو اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں۔اگر وہ (سودا کرتے ہوئے) سچ بولیں اور (صحیح بات کو) ظاہر کر دیں تو ان کے سودے میں برکت ہوتی ہے۔اور اگر وہ (حقیقت کو) چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی خرید و فروخت میں برکت ختم ہو جاتی ہے۔''

(۳) شہداء کے درجات کا حصول۔جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ ' وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهِ)) (۳)

''جو شخص اللہ سے سچے دل سے شہادت مانگے اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کے مقام پر پہنچا دے گا' اگر چہ وہ اپنے بستر پر ہی فوت ہو جائے''۔

(۴) مصیبت سے نجات: حکایت ہے کہ ایک شخص دشمنوں سے بھاگ کر ایک نیک آدمی کے پاس جا پہنچا اور اسے کہا: مجھے دشمنوں سے چھپا لو۔اس نے کہا: یہاں لیٹ جاؤ۔اور اس پر کھجور کے پتوں کا گٹھا پھینک دیا۔دشمن اسے تلاش کرتے کرتے وہاں آ پہنچے اور نیک آدمی سے اس کے متعلق پوچھا۔اس نے کہا: وہ یہاں کھجور کے

۱) جامع الترمذی' کتاب القیامۃ' آخری باب۔ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔
۲) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب ما یمحق الکذب والکتمان من البیع۔
۳) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب استحباب طلب الشہادۃ فی سبیل اللہ۔

پتوں کے نیچے پڑا ہے۔ انہوں نے اس جواب کو مذاق سمجھا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اس طرح ایک نیک آدمی کے سچ کی وجہ سے اسے نجات مل گئی۔

سچ کے مظاہر

سچ مختلف احوال و کیفیات میں جلوہ نما ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۱) بات چیت میں سچائی: مسلم ہمیشہ سچی بات کرتا ہے۔ جب کسی کو کوئی خبر دیتا ہے تو اس طرح بتاتا ہے جس طرح وہ معاملہ حقیقت میں ہوا ہو۔ کیونکہ جھوٹ بولنا نفاق کا حصہ اور نفاق کی علامت ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ : إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ' وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))[1]

''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے' جب وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے' جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔''

(۲) معاملات میں سچائی: مسلمان جب کسی سے لین دین یا اور کوئی معاملہ کرتا ہے تو سچائی اختیار کرتا ہے' وہ نہ دھوکا دیتا ہے نہ فریب کرتا ہے' نہ جعل سازی سے کام لیتا ہے' نہ غیر واضح معاملہ کرتا ہے جس میں دھوکا دینا یا دھوکا کھانے کا احتمال ہو۔

(۳) عزم کی سچائی: جب مسلمان کسی ایسے کام کا پختہ ارادہ کر لیتا ہے جس کا انجام دینا مناسب ہے تو پھر اس میں تردّد سے کام نہیں لیتا' بلکہ کسی اور چیز کی پروانہ کرتے ہوئے اس کام میں مشغول رہتا ہے' حتیٰ کہ اسے تکمیل تک پہنچا لیتا ہے۔

(۴) وعدہ کی سچائی: مسلمان جب کسی سے کوئی وعدہ کر لے پھر اسے پورا کرتا ہے' کیونکہ وعدہ خلافی منافق کی علامت ہے۔ جیسے کہ مذکورہ بالا حدیث میں بیان ہوا ہے۔

(۵) حال کی سچائی: مسلمان کا ظاہر اور باطن یکساں ہوتا ہے۔ وہ حقیقت میں

---

۱) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب علامة المنافق۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب خصال المنافق۔

کچھ اور اور بظاہر کچھ اور نہیں ہوتا۔ وہ دکھلاوا نہیں کرتا' نہ تکلف کر کے اپنے اندر وہ خوبی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُسے حقیقتاً حاصل نہیں ہے ۔کیونکہ جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ یُعْطَ کَلَابِسِ ثَوْبَیْ زُوْرٍ)) (۱)

''جو چیز کسی شخص کو نہیں ملی اور وہ خود کو اس کا حامل ظاہر کرتا ہے وہ ایسے ہے جیسے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا۔''

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایسی چیزوں سے خود کو مزین کرتا ہے جن کا وہ مالک نہیں تا کہ دیکھنے والے اسے دولت مند سمجھیں' وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پھٹے پرانے کپڑے پہنے تا کہ لوگ اسے تارک الدنیا اور زاہد سمجھیں' حالانکہ حقیقت میں وہ زاہد نہیں۔

سچائی کی کچھ عظیم مثالیں

(۱) حضرت عبد اللہ بن حمساء رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں : رسول اللہ ﷺ ابھی منصب نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے کہ (ایک بار) میں نے حضور ﷺ سے خرید و فروخت کا کچھ معاملہ کیا۔ میں پوری ادائیگی نہ کر سکا اور میں نے آپؐ سے وعدہ کر لیا کہ میں بقایا یہیں لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ (اتفاق یہ ہوا کہ) میں بھول گیا۔ اور مجھے تین دن بعد یاد آیا (کہ میں حضور ﷺ کو اسی مقام پر انتظار کرنے کا کہہ کر آیا ہوں)۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ حضور ﷺ اسی مقام پر تشریف فرما تھے۔ فرمایا:

''جوان! تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ میں یہاں تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں''۔ (۲)

ایسا ہی واقعہ آنحضرت ﷺ کے جدّ امجد جناب اسماعیل علیہ السلام کو بھی پیش آیا تھا'

۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب المتشبع بما لم ینل وما ینھی من افتخار الضرۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب اللباس والزینۃ' باب النھی عن التزویر فی اللباس وغیرہ والتشبع بما لم یعط۔

۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی العدۃ۔

جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ان الفاظ میں آپؑ کی تعریف فرمائی:
﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴾ (مریم:۵۴) ''اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے' وہ یقیناً وعدے کا سچا تھا اور وہ رسول اور نبی تھا''۔

(۲) ایک بار حجاج بن یوسف نے خطبہ کو بہت زیادہ طول دے دیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص بول اٹھا: ''نماز پڑھائیے! کیونکہ وقت آپ کا انتظار نہیں کرے گا اور ربّ آپ کا عذر نہیں سنے گا''۔ حجاج نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس کے قبیلہ کے کچھ لوگوں نے حجاج سے کہا: ''وہ شخص تو پاگل ہے''۔ حجاج نے کہا: ''اگر وہ اقرار کرلے کہ اس کا دماغ صحیح نہیں تو میں اسے جیل سے رہا کردوں گا''۔ اس شخص نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ نے مجھے جس نعمت (عقل) سے نوازا ہے میں اس کا انکار کروں اور جس جنون سے اللہ نے مجھے محفوظ فرمایا ہے' خود کو اس سے متصف قرار دے لوں''۔ جب حجاج نے اس کی سچائی سے یہ محبت دیکھی تو اسے آزاد کردیا۔

(۳) حضرت امام بخاریؒ نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا۔ قصہ یوں ہے کہ امام بخاریؒ ایک شخص سے حدیث سننے کے لئے سفر کرکے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس کا گھوڑا بھاگ گیا ہے اور اس نے چادر کو اس طرح پکڑ رکھا ہے گویا اس میں جو ہیں۔ جب گھوڑا قریب آیا تو اس نے اسے پکڑ لیا۔ بخاریؒ نے کہا: ''آپ کے پاس جَو تھے؟'' اس نے کہا: ''نہیں' میں نے گھوڑے کو جھوٹ موٹ یہ ظاہر کیا تھا''۔ بخاریؒ نے فرمایا: ''میں اس شخص سے حدیث نہیں لوں گا جو جانوروں سے جھوٹ بولتا ہے''۔ جناب امام بخاریؒ کا یہ عمل سچائی سے متعلق ایک عظیم مثال ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات واحادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قسط وار سلسلہ (8)

جدید دنیائے اسلام

الجزائر (Algeria)

(گزشتہ سے پیوستہ)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگِ آزادی کا آغاز کرنے والے مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ انہوں نے 1945ء میں پہلی بار فرانسیسی افواج پر گوریلا طرز پر حملوں کا آغاز کیا' لیکن باقاعدہ جنگ کا آغاز نومبر 1954ء سے ہوا۔ نیشنل لبریشن آرمی کے حملوں کو فرانسیسی افواج نے بہت شدت سے کچل دیا' لیکن یہ آزادی اور حریت کی جنگ تھی' رُک نہ سکی۔ پہلے پہل گوریلا مجاہدین نے پہاڑی علاقوں اور گھنے جنگلات کو اپنا مرکز بنایا' جہاں وہ اپنی خفیہ پناہ گاہوں میں حملوں کے بعد پناہ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ گوریلا کارروائیوں کا دائرہ سارے الجزائر میں پھیل گیا۔

مجاہدین فرانس کے فوجیوں کے علاوہ ان الجزائری لوگوں کو بھی نشانہ بناتے تھے جو فرانسیسی استبداد کی حمایت کرتے تھے۔ فرانسیسی افواج جدید اسلحے سے پوری طرح لیس ہونے کی وجہ سے مجاہدین کی بڑی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہیں' لیکن جنگ نے الجزائر کو فرانس کے لئے ویت نام بنا دیا تھا۔ عالمی برادری سیاسی دباؤ ڈال رہی تھی اور مطالبہ کر رہی تھی کہ الجزائر سے فرانس اپنی فوجوں کو واپس بلائے۔ وسط 1956ء میں جنگ میں فرانس کا پلڑا بھاری تھا۔ فرانس نے مزید افواج الجزائر بھیج دی تھیں۔ ایک منظم فوجی منصوبے کے تحت بڑے بڑے شہروں' قصبوں اور علاقوں میں فرانسیسی افواج نے تمام اہم تنصیبات پر قبضہ کرلیا۔ مواصلات کے مرکز اُن کے قبضے میں تھے۔ جگہ جگہ مسلح دستے گشت کرتے۔ اس طرح ہر علاقے میں فرانسیسی افواج نے مرکزیت قائم کر کے مجاہدین کی سرگرمیوں کو کسی قدر روک دیا تھا۔ اس کا حل مجاہدین نے یہ نکالا کہ وہ شہروں میں اچانک حملے کرتے اور افواج کو نقصان پہنچا کر غائب ہو جاتے۔ شہروں میں ان کی حمایت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عام شہری فوجیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور جب بھی موقع ملتا اُن کے خلاف مجاہدین کو مکمل امداد فراہم کرتے تھے۔

فرانس نے مجاہدین کی نئی حکمت عملی کو ناکام بنانے کے لئے جبر و تشدد کا راستہ اختیار کیا۔

دارالحکومت الجزیرہ میں شدید ترین جنگ بھی اسی دور کا واقعہ ہے۔ اس شدید خونی معرکے سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ نیشنل لبریشن آرمی اس قدر مضبوط و مستحکم نہیں ہے کہ فرانس کی جوابی کارروائی کا مقابلہ کر سکے۔ الجزائری سیاسی رہنماؤں فرحت عباس اور بالخصوص مسالی حج نے تمام آزادی پسند گروپوں اور جتھوں کو ملا کر ایک نئی تنظیم ایف ایل این (نیشنل لبریشن فرنٹ) یعنی ''محاذِ قومی آزادی'' قائم کی۔ 1956ء تک تمام گروپوں' متوسط طبقے اور مذہبی گروپوں نے اپنی اپنی جماعتیں ''محاذ'' میں مدغم کر دیں۔ 1956ء میں محاذ نے ''جمہوریۂ الجزائر کی عبوری حکومت'' کے نام سے تیونس میں حکومت قائم کر دی جو ''جی پی آر اے'' کے مخفف سے سیاسی دنیا میں مشہور ہوئی۔ ایک دوا ساز اور مجاہدین کے ایک سرگرم گروپ کے سابق سیکرٹری جنرل یوسف بن خدہ کو 1960ء میں ''محاذ'' کا صدر بنایا گیا۔ وہ محاذ آزادی کے دفتر الجزائر لے گئے۔

1958ء میں فرانسیسی افواج نے سرحدیں مکمل طور پر بند کر کے مجاہدین کے ٹھکانوں کو ایک ایک کر کے نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان ٹھکانوں کے درمیان مواصلات کے نظام کو ختم کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ مجاہدین کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا جائے۔ تاہم ان رکاوٹوں کے باوجود مجاہدین نے ایک بار پھر محدود حملوں کا راستہ اختیار کیا۔ اس مرتبہ الجزائری خواتین نے بھی مجاہدین کا ساتھ دیا اور خود فوجی وردی پہن کر میدانِ جنگ میں اتر آئیں۔ فرانسیسی افواج نے خواتین پر ظلم ڈھائے' لیکن اب جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ایک بہادر مسلمان لڑکی جمیلہ بوہارد الجزائر کی حرمت بن گئی۔ فرانسیسی فوج نے اسے گرفتار کر کے 1958ء میں کورٹ مارشل میں پیش کیا۔ اس نے اپنے بیان میں جس جرأت سے جو سنہری الفاظ استعمال کئے' وہ الجزائر کی تاریخ کا مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ جمیلہ نے فرانسیسی افواج کے کمانڈر سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''ہاں یہ سچ ہے' میں اپنے ملک سے محبت کرتی ہوں' میں اپنے ملک کو اپنی زندگی میں آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور اسی مقصد کی خاطر' ہاں صرف اسی مقصد کی وجہ سے تم لوگوں نے مجھ پر تشدد کیا ہے' اور تم میری جان لینے پر تلے ہوئے ہو۔ لیکن یاد رکھو' جب تم ہمیں قتل کرتے ہو تو دراصل اپنے ملک کی آزادی کو قتل کرتے ہو' اس کی عزت کو داغدار کرتے ہو اور اس کے مستقبل کو خطرے میں ڈالتے ہو۔''

1960ء میں جب یوسف بن خدہ عبوری حکومت کا صدر دفتر تیونس سے الجزائر لے آئے تو انہیں بن بیلا اور بومدین جیسے سخت گیر اور انقلاب پسند لیڈروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' جنہیں چند ماہ قبل فرانس کی جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ ان درمیان انقلابی لیڈروں نے شہر تلمسان میں اپنی پارٹی کا پولٹ بیورو قائم کیا۔

1961ء تک بیس لاکھ افراد نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ پہاڑی علاقوں کی طرف نکل

گئے یا دوسرے میدانی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ ہزاروں افراد نے شہروں کا رخ کیا' جہاں پہلے ہی آبادی کا کافی دباؤ بڑھ چکا تھا اور نظم و نسق چلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ فرانس نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے دوہری پالیسی پر عمل کیا۔ ایک طرف شہریوں کو سمجھانے اور قائل کرنے پر زور دیا گیا کہ وہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ دوسری طرف مجاہدین اور دوسرے شہریوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ مسالی حج نے ''محاذ قومی آزادی'' سے نکل کر ''الجیرین نیشنل موومنٹ'' کے نام سے ایک نئی جنگجو جماعت بنالی۔ اس جماعت کو فرانس میں مقیم الجزائریوں کی مدد حاصل تھی۔ مکمل آزادی کے لئے یہ جماعت بھی ''محاذ'' کی طرح جنگ کی حامی تھی۔ جون 1960ء میں فرانس کے شہر میلن (Melun) کے مقام پر پہلی بار جنگ ختم کرنے کے لئے مذاکرات ہوئے جو ناکام رہے۔ فرانس نے 1961ء میں مئی کے مہینے میں دوبارہ مذاکرات کا آغاز کیا اور محاذ آزادی کی قیادت سے تبادلۂ خیال کیا۔ اس دوران میں گوریلا سرگرمیاں جاری رہیں۔ جنگ نے فرانس میں بھی بے چینی پیدا کر دی تھی' کیونکہ فرانس اکثر و بیشتر گوریلا کارروائیوں کا نشانہ بنتا تھا۔ ان کی خفیہ گوریلا کارروائیوں نے فرانسیسی عوام کو اپنی حکومت کے خلاف احتجاج پر مجبور کر دیا۔ حکومت فرانس کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب زیادہ عرصہ الجزائر کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہے۔

1961ء کے اواخر میں مجاہدین نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز پولیس ہیڈ کوارٹر کو بنا لیا۔ جہاں اور جس جگہ فرانسیسی پولیس کا کوئی اہلکار نظر آتا' اسے اڑا دیا جاتا۔ گوریلا مجاہدین کی سپیشل آرگنائزیشن (او اے ایس) ان کارروائیوں کو کنٹرول کرتی تھی اور ''محاذ آزادی'' کے چھاپہ مار بھی ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ فرانس کا صدر چارلس ڈیگال اس بات کا حامی تھا کہ او اے ایس کے ہاتھوں سب کچھ ختم ہو جانے سے پہلے ''محاذ آزادی'' کے ساتھ کوئی معاملہ کر لیا جائے' تاکہ فرانس کی ساکھ بحال رہے۔ چنانچہ پورا سال خفیہ مذاکرات میں گزر گیا۔ 18 / مارچ 1962ء کو الجزائر میں فرانسیسی افواج کے کمانڈر جنرل چارلس ایلڈرٹ نے فرانس کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ الجزائر کی عبوری حکومت کے صدر یوسف بن خدہ نے بھی ایسا ہی اعلان کر دیا' جس کے بعد فریقین کی جانب سے جنگ ختم کر دی گئی۔

اس جنگ میں جو چھ سال جاری رہی' آٹھ لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ایک لاکھ افراد کو کیمپوں اور جیلوں میں رکھا گیا۔ تین لاکھ ہجرت پر مجبور کر دیئے گئے' جبکہ تیس لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ ہر بیس الجزائریوں میں سے ایک شہید ہو گیا۔ ایک تہائی آبادی گھر سے بے گھر ہو گئی۔ الجزائر کی جنگ آزادی ایک ایسا معرکہ تھا جسے کوئی ایک نام دینا درست نہ ہو گا۔ اس جنگ میں الجزائر کے ایک ایک باشندے نے یکجان ہو کر صرف ایک مقصد ''آزادی'' کے لئے اپنا تن من دھن' سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ مذہبی جماعتوں' کمیونسٹ لیڈروں' قوم پرست رہنماؤں' مردوں' عورتوں' غرض ہر

کسی نے اپنا کردار ادا کیا اور بالآخر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس جنگ میں ترِیک ہر سپاہی مسلمان تھا۔ ملک آزاد ہوا تو وہ بھی دنیائے اسلام کا ایک آزاد اور خودمختار ملک تھا۔ تین جولائی 1962ء کو فرانس نے الجزائر کو باضابطہ آزاد ملک کے طور پر تسلیم کر لیا۔

جولائی 1962ء میں حصولِ آزادی کے بعد یوسف بن خدہ اور اس کے حامیوں نے دارالحکومت الجزیرہ کا کنٹرول سنبھال لیا' جبکہ باقی ماندہ ملک بن بیلا اور بومدین کے کنٹرول میں رہا۔ نیشنل لبریشن آرمی نے بن بیلا کی حمایت کی۔ حالات کا رخ یوسف بن خدّہ کے خلاف تھا۔ نئی قانون ساز اسمبلی کے ارکان کی جو فہرست مرتب کی گئی' وہ کمیونسٹ پارٹی' مسالی نواز اور بوضیاف کے بائیں بازو کے سوشلسٹ حامیوں پر مشتمل تھی۔ بن خدّہ اور اس کے حامی اس میں شامل نہ تھے۔ 25 ستمبر 1962ء کو الجزائر کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ بن بیلا اس کے پہلے وزیراعظم اور فرحت عباس صدر قرار پائے۔ نیا آئین بنایا گیا جس کی رو سے اسلام کو نئی مملکت کا مذہب اور عربی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

1963ء۔ 15 ستمبر کو بن بیلا کو باقاعدہ صدر منتخب کیا گیا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ محاذ آزادی (ایف ایل این) کو اعلیٰ طبقے کی محافظ فوج کی حیثیت دی جائے یا اسے ایک عوامی جماعت بنا دیا جائے۔ صدر بن بیلا اسے اعلیٰ اور مخصوص افراد کی جماعت بنانے کے حق میں تھے۔ وہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بن بیلا کے آمرانہ اقدامات نے فوج میں بدامنی اور خلفشار کو جنم دیا۔

1965ء' جون۔ وزیر دفاع کرنل حواری بومدین نے کسی خون خرابے کے بغیر بن بیلا کا تختہ الٹ دیا۔ اسمبلی کو توڑ دیا' آئین کو معطل کر دیا اور اس کی جگہ ایک انقلابی کونسل قائم کر دی۔ بومدین انقلابی کونسل کی سربراہی کے علاوہ وزارت عظمیٰ اور وزارتِ دفاع اپنے پاس رکھتے ہیں۔ بن بیلا کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ نئی حکومت نے ملک کے حالات سے مطابقت رکھنے والے سوشلزم کو اختیار کرنے کا اعلان کیا' اور یہ بھی وعدہ کیا کہ ''ملک ایک حقیقی جمہوری ریاست ہوگا' جس میں قانون کی حکمرانی ہوگی''۔

1967ء۔ عرب اسرائیل جنگ میں الجزائر نے بھی اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا' امریکہ سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے اور روس سے انتہائی قریبی فوجی اور اقتصادی روابط قائم کر لئے۔

1968ء۔ بومدین نے اپنے خلاف ایک بغاوت کو کچلتے ہوئے ''محاذ آزادی'' (فرنٹ) اور فوج میں اپنے مخالفوں کو نکال باہر کیا۔ ایک قاتلانہ حملے سے بچنے کے بعد ہزاروں مخالفین کو گرفتار کر لیا۔

1971ء۔ فرانسیسی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ فرانس نے جواب میں الجزائر سے خصوصی تعلقات منقطع کر لئے۔ بومدین کی حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع ہوتی ہے' جس میں

طلبہ ہراول کا کام دیتے ہیں۔ احمد مدغری کی وفات اور بعض اہم رہنماؤں کی برطرفی، علیحدگی یا جلاوطنی کے بعد ''فرنٹ'' میں بومدین واحد رہنما رہ گئے جو تحریک آزادی کے وقت سے اب تک ''فرنٹ'' کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔

1973ء۔ امریکہ سے اقتصادی معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے امریکہ الجزائر کی قدرتی گیس ایک ارب مکعب فٹ یومیہ کے حساب سے آئندہ 25 سال تک درآمد کرے گا۔ اس اقتصادی معاہدے کے بعد امریکہ اور الجزائر کے مابین دوبارہ سفارتی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

1976ء۔ مغربی صحارا میں مراکش اور ماریطانیہ کی فوجوں سے الجزائری فوج کی جھڑپیں ہوتی ہیں۔ نیا آئین منظور کر کے نافذ کیا جاتا ہے۔ نئے انتخابات ہوتے ہیں۔ بومدین کو صدر منتخب کر لیا جاتا ہے۔

1977ء۔ فرنٹ کو ملک کی نگران جماعت بنا دیا گیا، جس کا کام لیبر یونینوں، کسانوں کی تنظیموں، سابقہ فوجیوں، خواتین، طلبہ کی تنظیموں، علماء اور مذہبی جماعتوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ گویا سیاسی جماعت کو انتظامیہ اور مقامی بیوروکریسی کا نگران بنا دیا گیا، جس سے نظم و نسق اور سرکاری کاموں کی انجام دہی میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

1978ء۔ حواری بومدین کا انتقال ہوا۔ اب اس کی قائم کردہ انقلابی کونسل توڑ کر ایک زیادہ بڑی مرکزی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے 160 ممبران تھے۔ انہوں نے ویرون ملٹری ڈسٹرکٹ کے کمانڈر شاذلی بن جدید کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ شاذلی نے 19 ارکان کی ''پولٹ بیورو'' نامزد کی۔ آئین کی رو سے پارٹی کا سیکرٹری جنرل ہی ریاست کا سربراہ ہوتا ہے، چنانچہ مرکزی کمیٹی نے شاذلی ہی کو ملک کا صدر بنا دیا۔

1980ء میں فرنٹ کی خصوصی کانگریس میں شاذلی کو پارٹی کی بالائی قیادت اور اس کے ڈھانچے میں تبدیلیوں کے لئے مکمل اختیارات دیئے گئے۔ انہوں نے پولٹ بیورو کے ارکان کی تعداد گھٹا کر سات کر دی۔ پارٹی کے اجلاسوں کی روٹین ہفتہ وار سے گھٹا کر ماہانہ کر دی اور اختیارات کو اپنی ذات میں مرتکز کر لیا۔ انہوں نے قومی اسمبلی کے الیکشن کے لئے امیدواروں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے نیا قومی کمیشن تشکیل دیا۔ فرنٹ کے صدر ایک سابق فوجی محمد شریف ساویہ کی چھٹی کرا دی اور اس کی جگہ اپنے برادرِ نسبتی عبدالحمید موری کو فرنٹ کا صدر بنا دیا۔ اس نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ وہ فرنٹ کو اپنی پرانی صورت میں واپس لائے گا اور اس میں معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی دے گا، جس کا مطلب تھا پارٹی کے اندر اور باہر جمہوری اصلاحات۔ شاذلی نے پولٹ بیورو کے اختیارات کم کر دیئے۔ پولٹ بیورو سے بومدین کی سخت گیر پالیسی کے حامی کرنل یہووی اور سابقہ وزیر خارجہ بوطفلیکا اور بومدین کے دوسرے حامیوں کو نکال باہر کیا جن میں بومدین کے سرکردہ سیکورٹی افسر بھی شامل تھے۔ (1980ء میں بن بیلا کو پندرہ سالہ نظربندی سے رہائی ملی، لیکن انہیں حکومتی

ڈھانچے سے دور رکھا گیا)۔

بومدین کی وفات کے بعد الجزائر کے شہروں' قصبوں اور دیہات تک میں اسلام پسند تنظیموں کے احتجاجی مظاہرے روزمرہ کا معمول بن گئے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کے مظاہروں نے امن و امان کی صورتِ حال ابتر کر دی۔ ''اخوان المسلمین'' کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ اقتصادی بدحالی کے مارے ہوئے لوگ احتجاج کے سوا کیا کر سکتے ہیں' لیکن حکومت عوام کے مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں کچلنے کے لئے فوج سے مفاہمت کر لیتی ہے —— فوج جو ہمیشہ حکومت میں اپنا حصہ مانگتی ہے۔

1988ء' نومبر میں فرنٹ کے کنونشن میں پارٹی اور سٹیٹ کی علیحدگی کا آغاز کر دیا گیا۔ کنونشن میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل کو' جس کا نام بحیثیت عہدہ ملک کی صدارت کے ساتھ وابستہ چلا آ رہا تھا' ختم کر دیا گیا۔ پارٹی کے پولٹ بیورو کو بھی موقوف کر دیا گیا۔ صرف مرکزی کمیٹی کو باقی رہنے دیا گیا جو زیادہ اور بڑی نمائندہ تھی۔

پارٹی کی اصلاحات کے سلسلے میں موری کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پارٹی کے اندر تین گروپ تھے۔ اصلاح پسند' پرانے نظریات کے حامل ارکان اور اسلام پسند حلقہ جسے طنزاً ''داڑھی بردار'' کہا جاتا تھا۔ بومدین سے پہلے بن بیلا کے دور میں فرنٹ کی صف اول میں دانشور اور انقلابی سوچ رکھنے والے مفکر' ادیب اور کارکن شامل تھے۔ بومدین کے دور میں زیادہ تر اسامیوں پر فوجیوں کا غلبہ ہو گیا۔ شاذلی بن جدید کا انتخاب اصلاح پسندوں اور سوشلسٹوں کے درمیان ایک قسم کا سمجھوتہ تھا۔ شاذلی کے عہد میں پرانے نظریات کے حامل ارکان کا صفایا کر دیا گیا۔

1991ء' دسمبر۔ الجزائر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عام پارلیمانی انتخابات ہوئے۔ اسلام پسند پارٹی ''فرنٹ اسلامی نجات'' (ایف آئی ایس) بھاری اکثریت سے جیت گئی' لیکن فوج کو اسلام پسندوں کی فتح پسند نہ آئی۔ فوج نے کسی دلیل کے بغیر الیکشن کے نتائج کو منسوخ کر دیا۔ فوج کی اس دھاندلی پر الجزائر کے عوام نے اسی جوش سے احتجاجی تحریک چلائی جس جوش و خروش سے انہوں نے فرانس کے خلاف تحریک آزادی چلائی تھی۔ ملک میں خانہ جنگی چھڑ گئی جو 1998ء تک جاری رہی۔ شہروں سے نکل کر دیہات تک میں قتل و قتال شروع ہوا۔ بین الاقوامی اداروں کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ افراد خانہ جنگی میں ہلاک ہوئے۔ حکومت خانہ جنگی کو روکنے میں بالکل ناکام ہو گئی' کیونکہ فوج کے ساتھ مل کر وہ خود بھی فریق تھی۔ فوج نے بھی منہ پھیر لیا۔ وہ تماشائی بنی رہی۔ الجزائر نے عالمی برادری کی ثالثی کی پیشکشوں کی پروا نہ کی' اپنی جنگ کو اپنی سرحدوں تک محدود رکھا اور بیرونی دنیا کو بے خبر رکھا۔

1999ء' اپریل۔ نئے الیکشن ہوئے' جس کے نتیجے میں عبدالعزیز بوطفلیکا کو صدر منتخب کیا گیا

جو آج فروری 2004ء تک کرسیٔ صدارت پر براجمان ہیں۔ انہوں نے صدر منتخب ہونے کے چھ ماہ بعد ستمبر میں ریفرنڈم کرایا جس میں انہیں 98 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ ریفرنڈم کرانے کا مقصد یہ تھا کہ خانہ جنگی کے دوران میں ایف آئی ایس کے جو افراد قتل' خواتین کی بے حرمتی اور دوسرے سنگین جرائم میں ملوث نہیں' انہیں رہا کر دیا جائے اور قومی مصالحت کی راہ نکالی جائے۔ خیال یہ تھا کہ ایسے اقدامات سے ملک میں امن وامان کا ماحول قائم ہوگا اور برسوں خانہ جنگی میں مبتلا رہنے والے اس بدنصیب ملک کے لوگوں کو بھی سکھ کی روٹی نصیب ہوگی' لیکن ہوا یہ کہ عبدالعزیز صاحب ریفرنڈم میں بھاری اکثریت حاصل کرنے کے باوجود فوج کی گود میں جا بیٹھے' کیونکہ فوج کی حمایت و مدد کے بغیر مضبوط سے مضبوط لیڈر کا بھی کرسیٔ صدارت پر بیٹھنا ممکن نہیں۔ الجزائر آئین کی رو سے بظاہر ''الجمہوریہ'' ہے' لیکن فی الحقیقت بدترین فوجی آمریت والا مسلم ملک ہے۔

فوجی آمریت کے خلاف' جب بھی الجزائر کے عوام کو موقع ملتا ہے' احتجاجی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مظاہروں کی تحریک گرم ہونے لگتی ہے کہ فوج آگے بڑھ کر اسے ٹھنڈا کر دیتی ہے' اور یوں الجزائر کی تاریخ جمود کی برفیلی ٹھنڈک میں ٹھٹھری ہوئی کھڑی ہے۔ لیکن ہم اس کی پچھلی تاریخ کو یہیں چھوڑ کر جدید الجزائر میں احیائے اسلام کی تحریک کی طرف آتے ہیں کہ ''میثاق'' کے حوالے سے ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔

اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش

1962ء میں حصولِ آزادی سے لے کر آج تک جتنی بھی حکومتیں الجزائر میں برسراقتدار آئیں انہوں نے اپنی خارجہ پالیسی میں ایک بات کو بنیادی اینٹ کے طور پر استعمال کیا۔ ہر حکمران نے بیرونی دنیا کو یہ تاثر دیا کہ الجزائر میں اسلامی انقلاب آنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگر اسلام پسند جماعتوں اور تنظیموں کو آزادی دی گئی تو وہ کسی بھی لمحے ایسا کھیل کھیلیں گی کہ زمامِ کار لبرل سیاست دانوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے گی۔ اپنی اس بات یا نظریئے کو ثابت کرنے کے لئے ہر حکومت یہ دلیل سامنے لاتی ہے کہ جنگِ آزادی میں علماء نے ہراول کا کام دیا۔ آزادی کی طویل اور خوفناک جنگ میں اسلام ہی نے لوگوں کو منظم و متحد ہونے کا جذبہ دیا تھا۔ اب اس جذبے پر بند نہ باندھا گیا تو داڑھی بردار علماء الجزائر کو مستقبل کی روشنی میں لے جانے کی بجائے ماضی کے اندھیروں میں لے جائیں گے۔ تمام عرب ممالک' امریکہ اور یورپ' تمام لبرل اور سیکولر ممالک اس منطق کو تسلیم کرتے رہے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ الجزائر جیسے بڑے مسلم ملک میں اسلامی قوتوں کو برسراقتدار آنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔

فرانس کو اپنے استعمار کے اوائل ہی میں اس بات کا تجربہ ہوگیا تھا کہ قبضہ مستحکم کرنے کے لئے علماء اور صوفیاء کے وجود کا خاتمہ ضروری ہے۔ فرانس کے لئے اسلام ایک مستقل فوجی خطرہ تھا' جو

مسلمانوں کو ہر دم جہاد کے لئے تیار و مستعد اور سامراجی طاقتوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دیتا ہے۔ فرانس نے پورے الجزائر پر قبضہ جمانے کے بعد مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کے تقرر کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مساجد میں درس و تدریس اور عربی زبان کی تعلیم پر مکمل پابندی لگا دی گئی تھی۔ پولیس خطباتِ جمعہ کی باقاعدہ خفیہ ڈائری مرتب کر کے حکام کو بھیجتی تھی۔ اس امر کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ اسلام کے معاشی اور سماجی نظام پر کوئی مجلس یا اجلاس نہ ہو' تاکہ رفتہ رفتہ لوگ ایک دو نسلوں میں اسلام کی تعلیمات و نظریات سے بالکل نابلد اور بے خبر ہو جائیں۔

شیخ عبدالحمید بن بادیس بہت زیرک عالم تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرانس کی حکمتِ عملی کے تحت علماء کو آہستہ آہستہ منظر سے ہٹایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان کی ''جمعیت العلماء المسلمین'' نے اس خلاء کو پر کرنے کے لئے منصوبہ بنایا اور 1925ء سے اس تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا۔ بن بادیس کے ساتھ ساتھ ایک اور شخصیت کا ذکر ضروری ہے۔ شیخ الطیب العقابی نے ''پروگریس کلب'' قائم کر کے 1931ء سے عوام کو روحانی اور نظریاتی طور پر اسلام کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کا اہم فریضہ سرانجام دینا شروع کیا۔ ان بزرگوں کی اسلامی تحریکیں سارے ملک میں پھیل گئیں۔ لوگوں میں اپنے اپنے محلے میں چندہ گیری سے مسجدیں بنانے کا شوق بیدار ہوا۔ جب فرانسیسی حکام کسی مسجد پر قبضہ کرتے تو لوگ علماء کی قیادت میں کسی گھر یا کسی کمیونٹی سنٹر کو مسجد میں تبدیل کر لیتے۔ فرانسیسی استبداد کے ردعمل کے طور پر دینی مدارس بھی تیزی سے قائم ہوتے چلے گئے۔ لوگوں میں یہ شعور پختہ ہوتا چلا گیا کہ غیر ملکی حکمرانوں نے انہیں مذہبی' تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے بانجھ بنانے کا جو منصوبہ بنایا ہے' ہمیں اس منصوبے کو سختی سے ناکام بنانا ہے۔ الجزائری عوام کے اس زبردست مزاحمتی جذبے نے انہیں جینے کا ایک انداز دے دیا تھا۔ نئے سکولوں میں عوام اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے خیال سے جاتے تھے جو قانونی پابندیوں کی وجہ سے محدود ہوتے جا رہے تھے۔ فرانسیسی اساتذہ کے زیر انتظام چلنے والے تعلیمی اداروں نے بھی الجزائری معاشرے میں ایسے طبقے پیدا کر دیئے تھے جن میں رہن سہن' نشست و برخاست' اندازِ گفتگو' انداز طعام اور اندازِ فکر قطعی طور پر مغربی اور فرانسیسی ہو چکا تھا۔ عوام اس نئے اندازِ زیست کے خلاف بھی اپنے اندر ایک خاص نفرت محسوس کرتے تھے۔ عربی زبان کے تحفظ' ترویج اور تعلیم پر زور بھی اسی ردعمل کی تحریک سے پیدا ہوا تھا۔

سیاسی جماعتیں دیکھ رہی تھیں کہ لوگوں پر مذہبی عوامل گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں اور لوگ تیزی سے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے بددل ہو رہے ہیں۔ نومبر 1954ء میں جس فکری انقلاب کا آغاز ہوا اُس کی سیاسی نظریہ بندی اور تنظیم میں تیس سال پہلے شروع ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکوں کا اثر بڑا نمایاں اور گہرا تھا۔ سیاسی جماعتوں کا اثر کم اور سطحی رہا۔ اسلامی نظریات لوگوں میں سامراج کے خلاف زبردست جدوجہد کو اپنی جذباتی زندگی کا حصہ بناتے تھے' اس لئے لوگ

فرانسیسی سامراج کے مقابلے میں نکلنا اپنا دینی اور مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ نیشنل لبریشن آرمی میں علماء کو ''مرشدوں'' کے عہدے پر تعینات کیا جاتا۔ مرشد لوگوں کو جنگ آزادی کے تقاضوں سے روشناس کراتے اور انہیں آگے بڑھ کر جینے اور مرنے کے راستے بتاتے جو دراصل اسلام کے نظریۂ جہاد کی عملی تعبیر ہوتی۔ جنگ آزادی کے مجاہدوں کو متحرک کرنے کے لئے قرآنی آیات پر مبنی نعرے عام ہوتے گئے' حتیٰ کہ ایسا مرحلہ بھی آیا کہ دورانِ جنگ زخمی ہونے والے مجاہدوں نے ان ڈاکٹروں سے مرہم پٹی کرانا بھی ترک کردی جو پانچ وقت نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری جنگ تو انہی سیکولر عناصر کے خلاف ہے جو دین کو اپنے مقاصد کے لئے تو استعمال کرتے ہیں لیکن دین پر عمل نہیں کرتے۔

ملک سے باہر الجزائریوں کی جتنی بھی قیادت تھی' اس کی غالب اکثریت سیکولر تھی۔ ان ممتاز اور سربرآوردہ لوگوں کی نظریں ہمیشہ فرانس کی خوشنودی حاصل کرنے پر مرکوز رہتی تھیں۔ جنگ آزادی کے لئے جو گروپ کام کر رہے تھے' ان میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ کمیونسٹوں نے 1962ء کے ''طرابلس پروگرام'' کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا' جس کے ذریعے وہ یہ اعلان کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ الجزائر کا انقلاب اسلامی نہیں' بلکہ سوشلسٹ انقلاب ہوگا۔ محاذ جنگ پر اگلے موروچوں پر لڑنے والے فوجی افسروں میں سے جو بعد ازاں جنگِ آزادی میں شریک ہوئے' وہ باقاعدہ اعلان کرتے تھے کہ وہ لینن' مارکس اور ماؤزے تنگ سے متاثر ہیں۔ 1962ء میں حصول آزادی کے بعد جب یوسف بن خدّہ جیسے رہنما سیاست سے کنارہ کش ہوئے اور بن بیلا نے قیادت سنبھالی تو نئے حکمرانوں کا بنیادی نظریہ اشتراکی انقلاب برپا کرنا قرار پایا۔ نئی حکومت میں کمیونسٹوں کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسلامی عناصر آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے۔

سیکولر قوتوں کا غلبہ

یہ ایک حیرت انگیز تبدیلی تھی۔ الجزائر میں اسلام نے فرانسیسی تسلط سے لے کر حصولِ آزادی تک تمام مراحل میں مرکزی اور فعال کردار ادا کیا تھا' لیکن جب حکومتیں بننے کا وقت آیا تو اسلام کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور اشتراکیت حکومت کے ہر شعبے میں حلول کر گئی۔ نئے حکمرانوں کو الجزائری عوام میں اسلام کی طاقت واثر آفرینی کا علم تھا' اس لئے وہ کوشش کرتے تھے کہ ایک طرف عوام کے سامنے اسلام کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکالیں اور دوسری طرف رفتہ رفتہ عوام سے علماء کا اثر اور رابطہ ختم کر دیا جائے۔ علماء کے طبقے میں سے اپنے مطلب کے افراد چن کر حکومت کے مختلف شعبوں میں داخل کر لئے گئے۔ چنانچہ علمائے سو نے حکومت کو مارچ 1963ء میں نئے دستور اور قوانین کے لئے آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ کی ایسی منفی تعبیرات پیش کیں جن کو سیاسی رنگ دے کر صنعتوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ اپریل 1964ء میں محاذ قومی آزادی یعنی فرنٹ کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں کمیونسٹوں نے ''الجزائری چارٹر'' کے نام سے اپنا پروگرام پیش

کیا۔اس پر خاصی طویل بحث ہوئی۔لوگوں نے کہا کہ اسلام کو الجزائر میں زبردست مقبولیت حاصل ہے اور ہمارا اصل چارٹر اسلام ہے۔فرنٹ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور ایک ایسا پروگرام منظور کیا جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ سوشلسٹ ہونے کے باوجود اسلامی بھی ہے اور الجزائر کے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔اس کی مثال وہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیش کیا تھا۔کہا گیا تھا کہ اسلامی سوشلزم پاکستان کے عوام کی امنگوں کا ترجمان ہے۔الجزائر کا اسلامی سوشلزم بھی ایک نیم پختہ اقتصادی پروگرام تھا جس نے پہلے سے موجود ڈھانچے کو بھی منتشر کر کے رکھ دیا' اور اگر کوئی فائدہ پہنچایا تو چند مخصوص افراد اور بیوروکریسی کو۔عوام نے علماء کی رہنمائی میں اسلامی سوشلزم کے پروگرام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔خصوصاً شیخ البشیر الابراہیمی نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی۔شیخ ابراہیمی احمد بن بادیس کے جانشین تھے۔ وہ 1940ء سے 1955ء تک اس منصب پر فائز رہے۔انہوں نے قاہرہ ریڈیو کے ''صوت العرب'' پروگرام سے 1955ء میں اپنی تاریخ ساز تقریر نشر کی تھی اور عوام سے پر جوش انداز میں کہا تھا کہ وہ نیشنل فرنٹ کی جنگ آزادی کے لئے کام کریں۔شیخ ابراہیمی کو اسلامی سوشلزم کی مخالفت کرنے کے جرم میں نظر بند کر دیا گیا۔ان کی نظر بندی کے خلاف ''جمعیۃ القیام الاسلامیہ'' نے دارالحکومت کے سب سے بڑے ہال میں سب سے بڑا جلسہ کیا۔یہ جلسہ اتنا زبردست اور اثر انگیز تھا کہ ایوانِ اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی ذرائع ابلاغ میں بھی اس کا مدتوں چرچا رہا۔اس جلسے سے یہ بات ایک بار پھر ثابت ہوگئی کہ اب بھی حکمران ''نیشنل لبریشن فرنٹ'' کے مقابلے میں اسلامی تحریک زیادہ مقبول ہے۔اس صورت حال سے فرنٹ کے اندر موجود اسلامی عناصر کو تقویت ملی' اور اشتراکی اور اسلامی عناصر کے درمیان جو کشمکش دیر سے چلی آرہی تھی' وہ اتنی شدید ہوگئی کہ 19 جون 1965ء کو کرنل حوری بومدین نے بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

کرنل حوری بومدین کی حکمتِ عملی

کرنل بومدین نے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی' اور اس حوالے سے ان کا تعارف ایک دینی پس منظر رکھنے والے فرد کے طور پر پہلے سے ہو چکا تھا۔اُن کے اقتدار سنبھالنے پر عوام نے انہیں خوش آمدید کہا۔وہ بن بیلا کے کمیونسٹ مشیروں کی مخالفت بھی کھلے عام کرتے رہے تھے۔اس لئے بھی ان کا اقتدار میں آنا اسلامی قوتوں کے لئے ایک نیک شگون تھا۔بومدین نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اہم حکومتی عہدے اسلامی جماعتوں کے نمائندوں کو تفویض کر دیئے۔وزارت اطلاعات ونشریات کا قلمدان شیخ ابراہیمی کے فرزند شیخ طالب ابراہیمی کے سپرد کر دیا' جن کو بن بیلا نے جلاوطن کر کے صحرا میں قید کر رکھا تھا۔اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی کے لئے قرعہ فال شیخ العباسی بن الحسین کے نام نکلا۔جمعیت العلماء المسلمین کے سرکردہ رہنماؤں کو مختلف سرکاری شعبوں میں اہم انتظامی عہدے

دیئے گئے۔ نظامتِ اعلیٰ تعلیم کا منصب شیخ مالک بن نبی کو دیا گیا۔ بن نبی بڑے پائے کے مصنف تھے۔ انہوں نے بومدین کے فوجی انقلاب کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالات اور مضامین تحریر کئے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے عوام کو تلقین کی کہ وہ انقلاب کے حقیقی مقاصد کی طرف توجہ دیں۔ انہوں نے عام زندگی میں بدعنوانی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر بھی تنقید کی۔

ان تمام مثبت اقدامات کے باوجود معاشرے میں بدعنوانی کو فروغ ملتا گیا۔ نیشنل فرنٹ کے اندر جو بدعنوانی اور کرپشن جڑ پکڑ چکی تھی' وہ کم ہونے کی بجائے اندر ہی اندر زہر کی طرح زیادہ سرایت کر گئی۔ زیادہ دکھ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ خود جمعیت العلماء المسلمین میں بھی ناپسندیدہ عناصر نے راہ پالی اور بدعنوانی علماء کا بھی شیوہ بن گیا۔ اس نئی صورت حال میں شیخ عبداللطیف السلطانی جیسے جید علماء نے حوری بومدین کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے 1971ء میں زرعی اصلاحات کے نفاذ کے خلاف بھی احتجاج کیا۔ ان کے انٹرویو مختلف اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ شیخ عبداللطیف اور ان کے ہم خیال علماء کو ایک بار پھر عوام میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ بومدین نے اپنے ملک میں جو چند اصلاحات نافذ کر کے نام کمایا تھا' وہ اس نے فروری 1974ء میں لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس (او آئی سی) میں اسلامی اصولوں کے خلاف تقریر کر کے گنوا دیا۔ ہر کسی نے اسلام کے بارے میں ان کے خیالات کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

عوامی تحریک کا آغاز

عوامی احتجاجی تحریک کا آغاز 1976ء میں شہر بلیدہ میں سرکاری اداروں پر حملوں سے ہوا' جس کے نتیجے میں اسلامی جماعتوں کے چند نوجوان کارکن گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں استاد محفوظ نحناح بھی شامل تھے۔ وہ متیجاہ کی مسجد میں اپنے خطباتِ جمعہ اور جوشیلی تقاریر کی وجہ سے سیاسی ماحول کو گرم رکھتے تھے۔ انہی کی تحریک پر یونیورسٹی کے طلبہ میں سٹڈی سرکل بنائے گئے جو بہت مقبول ہوئے۔ سٹڈی سرکل میں طلبہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے تھے۔ مختلف قومی' بین الاقوامی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے اسلامی تعلیمات سے ہدایات لینا بھی ان فکری حلقوں کا ایک اہم مقصد تھا۔ ایک مذاکرے میں اس امر پر غور کیا گیا کہ تعلیمی اداروں میں اشتراکی اور فرانسیسی نظریات کا مقابلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں کسی الجزائری تعلیمی ادارے میں پہلی مسجد 1968ء میں تعمیر کی گئی' جس کے بعد یہ رواج بن گیا اور یونیورسٹیوں میں مسجدیں بننے لگیں۔ الجزائر کی یورپی بستیوں میں مساجد کی تعمیر کے لئے باقاعدہ فنڈز قائم کئے جاتے اور ان کو پورا کرنے کے لئے چندہ سازی کی مہم چلائی جاتی۔ جس روز مسجد کا افتتاح ہوتا' محکمہ اوقاف والے آ کر اسے اپنی تحویل میں لے لیتے۔ سرکاری پیش امام' خطیب اور مؤذن کا تقرر ہوتا' اور یہ لازمی قرار دے دیا جاتا کہ جمعۃ المبارک کو سرکاری خطبہ ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ جو خطبہ حکومت فراہم کرتی اس میں انقلاب الجزائر کے

اشترا کی نظریئے کی تشریح کی جاتی اوراس پر عمل درآمد کی تلقین کی جاتی' اور عوام کو تنبیہہ کی جاتی کہ عمل نہ کرنے کی صورت میں سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ مساجد پر سرکاری کنٹرول کے مسئلے پر عوام سے کئی بار تنازعے ہوئے اور ہوتے رہے اور یوں حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات پروان چڑھتے رہے۔ عوام اظہار رائے کی آزادی مانگتے' جبکہ حکومت کسی بھی مسجد کو عوام کے لئے ''کھلا'' چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ بالآخر صدر بن بیلا نے خطیبوں کو اجازت دے دی کہ وہ اسلامی تعلیمات پر خطبہ دے سکتے ہیں' لیکن اس میں حکومت کے خلاف نکتہ چینی نہ ہونی چاہئے۔

1981ء میں ایک مسجد میں خطیب کو سرکاری طور پر خطبہ جمعہ کے دوران سختی سے روک دیا گیا' کیونکہ وہ حکومت پر تنقید کر رہا تھا۔ اس پر زبردست تصادم ہوا۔ پولیس نے مسجد کے اندر گھس کر فائرنگ کر دی' جس سے چند افراد شہید اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ 1982ء میں دارالحکومت میں زبردست عوامی مظاہرہ ہوا۔ اس مظاہرے کا مقصد یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے مسجد کو سیل کرنے' 22 طلبہ کو گرفتار کرانے اور اسلام کے خلاف کارروائیاں کرنے پر احتجاج کرنا تھا۔ ان طلبہ کو 1985ء تک جیل میں رکھا گیا۔ تشدد اور مار پیٹ کے ذریعے انہیں اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا رہا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ طلبہ کو پانچ وقت نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ عدلیہ نے 1985ء میں انہیں عدمِ ثبوت کی بناء پر رہا کر دیا گیا۔ عدلیہ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ یونیورسٹی میں قرآن پڑھنا اور لوگوں کو نماز کے لئے تلقین کرنا سزا کے لئے کافی جرم نہیں ہے۔

شہر عاشور میں 1982ء میں بھی ایسا ہی واقعہ ہوا' جب پولیس نے ایک خطیب کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ لوگوں نے پولیس کا اسلحہ چوری کر لیا اور اطلس کی پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ انہوں نے فروری 1987ء تک اپنی مزاحمت جاری رکھی اور پولیس کا مقابلہ کیا' لیکن بدقسمتی سے اس سال ان کا لیڈر مارا گیا۔ ان کی مزاحمت کو مغربی ذرائع ابلاغ دیدہ دانستہ نظر انداز کرتے تھے۔ ادھر حکومت مسلسل ایسے علماء سو کی تلاش میں رہتی تھی جن کو خریدا جا سکتا اور جنہیں محکمہ اوقاف میں ملازمت دے کر مسجدوں پر مامور کیا جا سکتا' جہاں حکومت پر تنقید کو گناہ قرار دیا جاتا۔ حکومت کے ایک اور اقدام نے بھی لوگوں کو متنفر کر دیا۔ وہ یہ کہ سادہ کپڑوں میں سرکاری اہلکار مسجدوں میں جا کر یہ نوٹ کرتے کہ کون کون شخص پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے۔ لوگوں میں یہ احساس شدت سے جڑ پکڑ رہا تھا کہ وہ اب بھی غیر ملکی استعمار کے عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں' وہ فرانس کے غلام ہیں اور ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ایسے اقدامات کے باعث رجوع الی الاسلام کی تحریک مزید تیز ہو گئی۔ احیائے اسلام کی تحریکوں اور تنظیموں نے دانستہ طور پر لٹریچر شائع کرنے سے اجتناب کیا' کیونکہ حکومت کے لئے ان پر گرفت کرنا آسان ہو جاتا۔ وہ سینہ بہ سینہ زبانی تعلیم و تلقین پر خاص زور دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں مسلسل خطرہ رہتا تھا کہ ان کی کتابیں' رسالے' پمفلٹ اور دوسرا تحریری مطبوعہ مواد ضبط کر لیا

جائے گا اور انہیں پابندِ سلاسل کر دیا جائے گا' جس سے ان کی اسلامی تحریک اور سرگرمیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ لوگ امام ابن تیمیہ کے نظریات کے زیادہ قریب تھے۔

فوج اور نیشنل فرنٹ کی سازشیں

عوام کو اسلامی تعلیمات کے اثرات سے ''محفوظ'' رکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ فکری سطح پر بند گلی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود خود کو آزاد نہ سمجھنے والے شہریوں کی ملکی ترقی میں شرکت کم ہوتی گئی۔ جبکہ دوسری طرف وہ لوگ جو حکمران جماعت (نیشنل فرنٹ) اور فوج میں اعلیٰ عہدوں اور اہم ذمہ داریوں پر فائز تھے' ان کی ذاتی خواہشات و مفادات نے کرپشن اور بدعنوانی کے عفریت کو اس قدر خوفناک کر دیا کہ معیشت کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ حکمران اور حکومت دونوں سیکولر تھے' جبکہ عوام ایک عوامی اور اسلامی معاشرے کے طلب گار تھے۔ عوام کو یقین تھا اور اب بھی ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد ملکی وسائل پر چند لوگوں یا چند خاندانوں کا قبضہ نہیں رہنا چاہئے' دولت کا ارتکاز ختم ہونا چاہئے' لیکن فرنٹ اور فوج نے مل جل کر ایسا نہیں ہونے دیا۔ عوام میں معاشی خوشحالی اور ترقی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

حکمرانوں کے سامنے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان پر آزادی کے بعد معاشرے کی ''تشکیلِ جدید'' کی ذمہ داری تھی۔ ان کا مقصد محض ملکی نظم و نسق کو چلانا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا' بلکہ ایک طویل' تھکا دینے والی جنگ آزادی کے کامیاب انجام سے ایک روشن صبح طلوع ہونی چاہئے تھی' جسے طلوع ہونے سے حکومت نے روکا۔ فرانس نے اپنے دور میں مقامی لوگوں کو اُن کی زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا' ان کی جگہ یورپی ممالک کے لوگوں کو آباد کر دیا تھا یا حکومت کے وفادار لوگوں کو۔ عوام کو بجا طور پر توقع تھی کہ آزادی کے بعد جب نیا سورج طلوع ہو کر نیا دور آئے گا تو ان کے آباء واجداد کی زمینیں انہیں واپس کر دی جائیں گی' اور مقامی لوگوں کو جس ظالمانہ طریقے سے تنگ کیا گیا تھا' اس کا ازالہ ہو سکے گا' نئے سرے سے دولت کی تقسیم ہو گی۔ صنعتوں کو فروغ ملے گا اور ایک نئے معاشی نظام کے لئے کام ہو گا جو آمدنی کے لئے صرف اور صرف تیل اور گیس کے ذخائر ہی پر بھروسہ نہیں کرے گا' بلکہ کچھ اور بھی منصوبہ بندی ہو گی۔ لیکن حکمران لوٹ کھسوٹ کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ وہ ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لئے 95 فیصد تیل اور گیس پر انحصار کرتے رہے' جس سے صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی رک گئی' جبکہ بے روزگاری' افراطِ زر اور مہنگائی میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا' جس سے عام آدمی کے لئے زندگی مزید دشوار اور کٹھن ہو گئی۔

اس معاشی اور معاشرتی ابتری نے جس سیاسی بحران کو جنم دیا تھا' اسے حکمران جماعت ''نیشنل فرنٹ'' اور فوج نے حل کرنے کی بجائے الٹی تدبیریں اختیار کیں' یعنی مفادات آپس میں بانٹ لئے'

جیسے یہ جنگِ آزادی کا مالِ غنیمت ہو۔ اقتدار عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہونے کی بجائے فوج اور نیشنل فرنٹ کے قبضے میں آ گیا۔ حکمران جماعت نے وعدے کئے کہ وہ جمہوریت لائے گی۔ جمہوریت لانے کے سب سے بلند آہنگ دعوے شاذلی بن جدید نے کئے تھے' لیکن وہ بھی وعدہ ایفا نہ کر سکے۔ فوج کی مداخلت نے انہیں جمہوریت کی راہ پر چلنے نہ دیا۔ شاذلی خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ اقتدار عوام کے ایسے نمائندوں کو منتقل ہو جائے جو اُن کے مقاصد اور اشتراکی نظریئے سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ الجزائر کا سیاسی بحران شخصیتوں کا پیدا کردہ ضرور تھا' بہرحال سیاسی بحران کی اصل وجہ نظریاتی بانجھ پن تھی۔ شخصیات بعض موقعوں پر وہ کردار ادا کرنے سے قاصر رہیں جو قومی قیادت کے حوالے سے ان کا فرضِ عین تھا' جبکہ نظریاتی بانجھ پن نے قائدین کو ایک مخصوص دائرے سے قدم باہر رکھنے کی اجازت نہ دی۔ ہر قائد نے ناکام نظام کے اندر رہ کر ہی اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی اور ناکامی کے اسباب جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ناکام نظام کے اندر کامیاب ہو جانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ رہبروں کا مقصد ہی رہزنی بن گیا تھا اور اسی لئے وہ ایسے نظام کو تسلسل دینے کی کوشش کرتے تھے جو بہرحال الجزائری معاشرے کے بالکل برعکس اصولوں پر قائم تھا۔

شاذلی بن جدید کا عہد

27 دسمبر 1978ء کو کرنل حوری بومدین کی وفات کے بعد نیشنل فرنٹ اور فوج کے باہمی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ شاذلی بن جدید مسندِ اقتدار تک محض اس لئے جا پہنچے تھے کہ انہیں فوج اور نیشنل فرنٹ دونوں حلقوں میں ایک غیر جانب دار شخصیت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ انہیں فی الواقعی دوسرے غیر جانب دار لیڈروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ غیر جانب دار اور اعتدال پسند خیال کیا جاتا تھا۔ وہ فوج اور نیشنل فرنٹ دونوں کے مفادات (الگ الگ) کے بہتر تحفظ کرنے کی پوزیشن میں تھے' اسی لئے انہیں فوجی بیوروکریسی بھی پسند کرتی تھی اور سول بیوروکریسی بھی۔ حوری بومدین نے ان کے لئے راستہ بھی اس طرح ہموار کر دیا تھا کہ نیشنل فرنٹ کا سیاسی کردار قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ نیشنل فرنٹ کی جگہ بومدین نے سیاسی جرنیل پیدا کئے تھے جو ملک کی سیاسی نگاری کرتے تھے اور ہر طرح کی سیاسی منصوبہ سازی (بلکہ منصوبہ بازی) وہی کرتے تھے۔ چنانچہ الجزائر میں ایک ایسی حکومت شاذلی کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی موجود تھی جس میں بظاہر فوج کی شرکت نہیں تھی' لیکن درپردہ تمام فیصلے فوج ہی کرتی تھی' جبکہ نیشنل فرنٹ کی حیثیت محض انتظامیہ کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ شاذلی بن جدید اور ان کی حکومت کے سامنے' فوجی جتنا اور سول بیوروکریسی کے زیر اثر' ہر وقت یہی بات رہتی تھی کہ کب اور کس موڑ پر ایک اتحادی کو چھوڑنا اور اس کی جگہ دوسرے اتحادی کو ساتھ ملانا ہے۔

چونکہ فوج اور نیشنل فرنٹ کے درمیان کوئی قابلِ ذکر راز نہیں رہا تھا' اس لئے باہم دست و

کریان رہنے والے سیاسی رہنما فوجی کمانڈروں کی حمایت کرتے اور فوجی کمانڈر اپنے مفادات کی خاطر اپنے پسندیدہ سیاسی رہنماؤں کو آگے لاتے۔ اس دوستی یا جنگ میں پلیٹ فارم نیشنل فرنٹ (پاکستان میں ''مسلم لیگ'' کی مانند) کا استعمال ہوتا۔ جب بھی سیاست دانوں نے کہا کہ فوج کی تنظیم نو ہونی چاہئے اور اس کو بیرکوں میں واپس جانا چاہئے' اس کا یہی نتیجہ نکلا کہ فوج نے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ سیاسی میدان نیشنل فرنٹ کے لئے کھلا نہیں چھوڑ سکتے۔ فوجی جرنیلوں کو اس قدر طاقت حاصل تھی کہ جب چاہتے صدر سے کوئی بھی فرمان دستخط کرا کر جاری کرا لیتے۔ چنانچہ انہوں نے شاذلی بن جدید سے ایک آرڈیننس جاری کرایا کہ ایسے سپیشل آرمی یونٹ قائم کئے جائیں جن کے کمانڈر نائبین کا کام کریں گے اور کمانڈر انچیف کی مدد کریں گے' جبکہ کمانڈر انچیف خود صدر مملکت تھے۔ اسی طرح فوجی جرنیلوں نے ''ملٹری کونسل'' بنوائی' جس میں بحری' بری اور فضائیہ کے کمانڈر شامل تھے۔ چنانچہ صدرِ مملکت کے مشیر سیاسی رہنما نہیں' بلکہ فوجی کمانڈر تھے۔ شاذلی بن جدید نے جب 1988ء میں ''ہنگامی حالت'' کا اعلان کیا تو یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ فوجی کمانڈر جب چاہیں اپنے اختلافات ختم کر کے حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ملک میں امن وامان کی ذمہ داری جنرل عبداللہ بالحوشت کی تھی۔ گویا وہ وزیر داخلہ تھے۔ یہ قدامت پسند جنرل تھے۔ فوج نے توازن برقرار رکھنے کے لئے ان کے ساتھ ترقی پسند' سوشلسٹ بریگیڈیئر خالد نذر کو تعینات کر رکھا تھا۔ شاذلی بن جدید جب بھی عوام کے سامنے آتے یہ دونوں فوجی ان کے دائیں بائیں موجود ہوتے تھے۔

جب شاذلی بن جدید نے فروری 1979ء میں مسند اقتدار سنبھالی تھی تو فوج اور سیاست کے درمیان باہمی اختلافات اپنے عروج پر تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا اقتصادی کساد بازاری کا شکار تھی۔ تیل کی قیمتوں میں کمی ہو رہی تھی۔ اس پر الجزائر کے سیاسی بحران نے مزید مخدوش صورتِ حال پیدا کر دی۔ شاذلی بن جدید تو اس نظام کے ایک قیدی تھے' وہ آنے والے بحرانوں کا حل کیا نکالتے۔ شاذلی بن جدید نے الجزائر کو عرب تشخص کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ عرب تشخص کا صاف مطلب یہ تھا کہ دوبارہ عربی زبان وتہذیب سے الجزائریوں کا رشتہ استوار کیا جائے' لیکن نیشنل فرنٹ کے اندر موجود مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ طالب ابراہیمی اور شریف موسیٰ کو فرنٹ کی مقتدر شخصیات کا درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے تہذیبی رویوں پر اپنے شخصی نظریات کی چھاپ لگا دی۔ دونوں میں فکری ونظری سطح پر اختلاف رائے تھا' اس لئے نیشنل فرنٹ میں گروپ بندی ہو گئی۔ بربر لوگوں کا خیال تھا کہ ملک کو عرب ازم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش پر سنجیدگی سے کام نہیں ہو رہا۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ عرب ازم کی تحریک کی آڑ میں انہیں سیاسی میدان سے نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ شاذلی کی یہ کوشش اس اعتبار سے بھی نامکمل اور نا تمام رہ گئی تھی کہ اس کے ذریعے عربی طلبہ کو ملازمتیں نہیں مل سکتی تھیں۔ عربی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو فرانسیسی

طرزِ تعلیم کے سرپرستوں نے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ اب بھی یہی صورت حال ہے کہ فرانسیسی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو عربی مدارس اور کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ پر مکمل فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر چند فوجی جرنیلوں نے 1986ء میں بغاوت کی بھی کوشش کی۔ اس بغاوت کو چند عناصر نے ملک میں بے چینی اور بدامنی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس بے چینی کی لہر کا بنیادی نعرہ تھا: ''الجزائر عرب نہیں ہے''۔ یہ ایک افریقی ملک ہے اور عربوں نے الجزائر کی دولت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ نظام عربوں کو تحفظ دے رہا ہے اور بربروں کو نظر انداز کر رہا ہے۔ بربروں کی کوشش یہ رہی ہے کہ الجزائر کا تعلق تاریخی ورثے سے جوڑا جائے۔ بربروں اور عربوں کی اس باہمی کشمکش میں عربوں کو فوقیت حاصل رہی۔ چنانچہ پیرس، تونس، مراکش اور لیبیا میں عرب سفیروں کا تقرر کیا گیا۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ الجزائر کے دارالحکومت میں مکانات بھی سیاسی بحران کا منظر نامہ بن گئے۔ اس شہر میں آٹھ لاکھ انسانوں کے رہنے کی گنجائش تھی، جہاں اب تیس لاکھ انسان بستے ہیں۔ حکام نے آبادی میں کمی کرنے کے لئے نسلی بنیادوں پر کام کیا۔ کمپیوٹروں کے ذریعے وہ علاقے جہاں آبادی کی گنجائش زیادہ تھی، مارک کیے گئے۔ ان علاقوں سے لوگوں کو زبردستی نکال کر ان کے آبائی علاقوں میں جانے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن دوسری طرف بیوروکریسی کے لئے اس شہر میں عالیشان اور پرتعیش مکانات تعمیر کیے گئے، جس سے عوام میں شدید ردِ عمل ظاہر ہوا...... (جاری ہے)

بقیہ: ظروف و احوال

مشیت ایزدی میں اس کی حفاظت منظور ہوئی تو بہتری کی کوئی صورت بھی نکل سکتی ہے لیکن بظاہر آثار کوئی حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ہم دلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے کے نعرے لگاتے ہیں لیکن درحقیقت ہمارے اندر دم خم نہیں ہے کہ بھارت کا مقابلہ کریں۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے وفادار بن جائیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ان تمام باتوں کو ختم کر دیں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں۔

❀ ❀ ❀

KHALID TRADERS

NTN

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

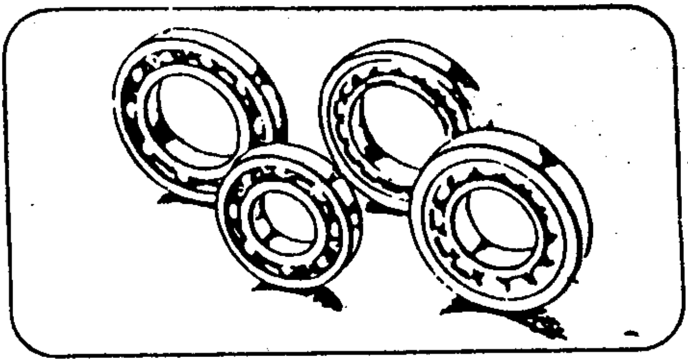

PLEASE CONTACT

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan.
G.P.O. Box # 1178 *Phones* : 7732952 - 7730595 *Fax* : 7734776 - 7735883
E-mail : ktnln@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : *SIND BEARING AGENCY*, 64 A-65
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلومؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں
کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص: 38 روپے' اشاعت عام: 22 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501